

نیرنگِ حکمت



ندیم شہزاد فدا



نیرنگِ حکمت

مصنف، ندیم شہزاد فدا

خاورئی، تحصیل جہانگیرہ، ضلع نوشہرہ

رابطہ: +92 333 900 4564

nadeemshahzadfida@outlook.com



پہلا ایڈیشن

۲۰۲۵

PAPERCRAFT
PUBLISHERS

پیپر کرافٹ پبلشرز
پرائیویٹ لمیٹڈ

نقی اسٹریٹ بالمقابل الطاف آٹوز نیلہ گمبد انار کلی لاہور
www.papercraftpublishers.com
+92-313-4192268

حقوقِ اشاعت کا تصدیقی اعلامیہ

یہ مکتوب بہ حیثیتِ سند اس امر کا گواہ ہے کہ زیرِ نظر کتاب نیرنگِ حِکمت، جو فکر و بصیرت کے متلاشیوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے، مصنف کی قلمی کاوش ہے۔ یہ کتاب نیشنل لائبریری آف پاکستان میں رسمی طور پر رجسٹر ہو چکی ہے، جو اس کے فکری و ادبی مقام کی سند ہے۔

بین الاقوامی قوانینِ اشاعت کے مطابق، اس کتاب کو درج ذیل بین الاقوامی معیارِ کتابت نمبر سے موسوم کیا گیا ہے

ISBN 978-627-7771-23-2
9 786277 771232

یہ تصدیقی علامت نہ صرف اس علمی شہ پارے کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے، بلکہ اس کی فکری ملکیت، خلاقانہ انفرادیت، اور مصنف کے حقوق کی مکمل حفاظت کی ضامن بھی ہے۔

تاریخِ اجرا: ۲۵ اپریل ۲۰۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ رب العزت کے بابرکت نام سے جس کی ذات وہ سربستہ راز ہے جسے جاننے کی خواہش میں عقل سرگرداں، اور ادراک محوِ حیرت ہے۔ وہ حقیقتِ مطلقہ ہے، وہ نورِ ازل ہے جو ہر شے کی تہہ میں جاری وساری ہے، مگر خود ہر تصور، ہر قیاس، اور ہر ادراک کی حد سے ماورا ہے۔ اس کی ہستی وہ نکتۂ آغاز ہے جہاں سے وجود کے تمام سلسلے جنم لیتے ہیں، اور وہی وہ نقطۂ انتہا ہے جہاں سب کچھ سمٹ کر فنا ہو جاتا ہے، مگر وہ خود فنا سے بھی پاک ہے۔

وہ وہی ہے جو تھا، جو ہے، اور جو ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کے ہونے میں کوئی تغیر، نہ اس کے جلال میں کوئی زوال، نہ اس کے کمال میں کوئی نقصان۔ وہ ازل سے لاشریک، ابد سے بے مثال، ہر صفت میں بے نظیر، ہر حیثیت میں بے ہمتا۔ انسان کی محدود عقل اس کے ہونے کو جاننے سے قاصر ہے، اور زبان اس کے کُنہ کو بیان کرنے سے عاجز۔ وہ ان معنوں میں پوشیدہ ہے کہ آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں، اور ان معنوں میں ظاہر ہے کہ ہر شے میں اسی کا جلوہ کارفرما ہے۔ وہ ہر ابتدا سے پہلے تھا، ہر انجام کے بعد بھی رہے گا، مگر خود کسی ابتدا و انتہا کے دائرے میں نہیں آتا۔ وہی ہے جو ہر شے کو وجود بخشتا ہے، اور وہی ہے جو عدم کو وجود میں بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے، وہ اسی کے نور کا عکس ہے، مگر وہ خود کسی عکس کا محتاج نہیں۔

یہ دنیا، یہ کہکشائیں، یہ زمان و مکان، سب اسی کے تخلیقی امر کا نتیجہ ہیں، مگر وہ خود ان سب قیود سے ماورا۔ اسے سمجھنے کی کوشش میں عقل بھٹک جاتی ہے، اسے پانے کی جستجو میں خیال کھو جاتا ہے، اور اسے بیان کرنے میں الفاظ دم توڑ دیتے ہیں۔

وہ وحدہٗ لاشریک ہے، مگر اس کی وحدت کسی عدد میں قید نہیں۔ وہ موجود ہے، مگر اس کا وجود کسی جسمانی یا مادی پیمانے میں نہیں تولا جا سکتا۔ وہ سننے والا ہے، مگر اس کے سننے میں کوئی کان درکار نہیں۔ وہ دیکھنے والا ہے، مگر اس کی بینائی کسی آنکھ کی محتاج نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے، مگر کسی مقام میں محدود نہیں۔

یہی وہ ذات ہے جس کے بارے میں الفاظ کا ہر سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، خیالات کی ہر پرواز تھک جاتی ہے، اور عقل کی ہر منزل دم توڑ دیتی ہے۔ وہ ہر شے کی حقیقت ہے، مگر خود کسی حقیقت کا محتاج نہیں۔ وہی آغاز، وہی انجام، وہی ظاہر، وہی باطن، وہی اول، وہی آخر۔ وہی وہ ہے، اور وہی وہ ہوگا۔

تمام تر درود و سلام، نبیوں کے تاجدار، رحمتِ دو عالم، ساقیٔ کوثر، شفیع المذنبین، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر، جن کی ذاتِ اقدس کائناتِ ہست و بود کا نقطۂ کمال ہے، جو مجسم رحمت ہیں، جو سراجِ منیر ہیں، جو بشیر و نذیر ہیں، اور جو اس کائنات کے سب سے برگزیدہ و معزز ہستی ہیں۔

وہی ہیں جو عبدیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوئے، وہی ہیں جن کی پیشانیٔ اقدس کو معراجِ قربتِ الٰہی کی رفعتیں نصیب ہوئیں، وہی ہیں جن کا ذکر خود خالقِ کائنات نے بلند فرمایا، وہی ہیں جن کے لیے زمین و آسمان کے خزانوں کے در وا کیے گئے، اور وہی ہیں جن پر رسالت کا تاج رکھا گیا۔

آپ ﷺ وہ ہستی ہیں جن کے لب ہلتے تو حق نازل ہوتا، جن کی زبان گوہر بار ہوتی تو حکمت کے دریا بہتے، جن کا ایک ایک حرف معرفت کے دروازے کھولتا، جن کی خاموشی بھی درسِ حکمت، اور جن کا کلام نورِ ہدایت ہوتا۔ آپ ﷺ کی گفتار میں جاذبیت، کردار میں عظمت، تبسم میں روشنی، اور مزاج میں وقار تھا۔

وہی ہیں جنھوں نے انسانیت کو تاریکی سے نکالا، وہی ہیں جو گم گشتہ قافلوں کے لیے نشانِ منزل بنے، وہی ہیں جو سسکتی روحوں کے لیے شفائے جاں ثابت ہوئے، وہی ہیں جن کی آمد سے ظلمتوں کے پردے چاک ہوئے، اور وہی ہیں جن کی سیرتِ مطہرہ قیامت تک رشد و ہدایت کا مینار رہے گی۔

آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ ایسے کہ دوست تو دوست، دشمن بھی آپ کی صداقت و امانت کی گواہی دیے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ ﷺ کی شفقت ایسی کہ بچوں کے لیے سایۂ عافیت، یتیموں کے لیے باپ، بیواؤں کے لیے آسرا، غلاموں کے لیے محافظ، اور امت کے لیے مشفق و مہربان بنے۔

آپ ﷺ وہ نبی ہیں کہ جن کے دستِ مبارک سے ٹوٹے دل جُڑتے، بیماروں کو شفا ملتی، بے کسوں کو سہارا ملتا، اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ ملتا۔ آپ ﷺ وہ امام ہیں کہ جن کی اقتداء میں ملائکہ بھی فخر کرتے، آپ وہ رحمت ہیں کہ جن کے قدموں کی خاک بھی متبرک ٹھہرتی، اور آپ وہ رہنما ہیں کہ جن کے نقشِ پا قیامت تک ہدایت کی علامت رہیں گے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سراپا تسلیم و رضا، محبت و الفت، عدل و احسان، اور حلم و بردباری کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ آپ ﷺ کی عبادت ایسی کہ راتیں سجدے میں بسر، دن بندگی میں مصروف، آنکھیں اشک بار، اور دل خشیتِ الٰہی سے لبریز۔

اسی محبوبِ خدا پر کروڑوں درود و سلام، جن کے ذکر کے بغیر عبادت ادھوری، جن کے نام کے بغیر دعائیں تشنہ، اور جن کی اطاعت کے بغیر کامیابی ناتمام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی شفاعت نصیب کرے، کہ وہی دارین میں کامیابی کی واحد کنجی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

پیشِ لفظ

ہر تحریر اپنے اندر ایک داستان سموئے ہوتی ہے، اور ہر قلم اپنی سیاہی میں ایک جہانِ معانی رکھتا ہے۔ نیرنگِ حکمت میری پہلی تصنیف ہے، جو نہ صرف میرے فکری سفر کی عکاس ہے بلکہ میرے جذبات، مشاہدات، تجربات اور تخیلات کی ترجمان بھی ہے۔

یہ کتاب ایک منفرد امتزاج پر مبنی ہے، جہاں حیات و کائنات کے اسرار، عشق و خرد کی وادیوں، فلکیات کی لاتناہی وسعتوں اور انسانی تخلیق کے اسرار اور رموز پر غور و فکر، ازل سے انسانی ذہن کا وظیفہ رہا ہے۔ اس متلاطم بحرِ فکر میں کبھی صوفیا نے اپنے کشف و وجدان سے معرفت کے موتی چنے، کبھی فلسفیوں نے عقل کے منطقے میں جست لگائی، اور کبھی سائنس دانوں نے خرد کے ذرّے کو تحلیل کر کے اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ مگر یہ تمام مکاتبِ فکر، چاہے وہ تصوف کے رموز ہوں، فلسفے کی موشگافیاں ہوں، یا سائنس کی پیچیدگیاں، ایک ایسی کڑی کی تلاش میں سرگرداں رہے جو انہیں حقیقتِ مطلقہ تک پہنچا سکے۔

یہ کتاب نیرنگِ حکمت اسی جستجو کا ایک ادنیٰ مظہر ہے، جس میں چار ایسے بنیادی موضوعات کو یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے جو بظاہر متضاد مگر درحقیقت ایک ہی نقطۂ وحدت کی شعاعیں ہیں۔ اول، اللہ کی ذات، جس کی ماہیت انسانی ادراک سے ماورا ہے، مگر اس کے آثار و تجلیات، کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہیں۔ یہ کتاب صفاتِ باری تعالیٰ پر محض ایک روایتی بحث نہیں بلکہ الٰہیات، سائنسی استدلال، اور فلسفیانہ منہج کی روشنی میں اس حقیقت کی جستجو ہے کہ "ہل من مزید" کی صدا کے پسِ پردہ کون سا راز مضمر ہے۔

دوم، فلکیات، جو بیک وقت طبیعی سائنس اور ماورائی حکمت کا امتزاج ہے۔ جدید سائنس نے کائنات کے سربستہ رازوں سے جو پردے اٹھائے ہیں، وہ قرآن کے بیان کردہ سائنسی اشارات سے کس قدر ہم آہنگ ہیں؟ یہ کتاب آسمانی اجرام، کونیاتی قوانین، بلیک ہولز، نظریۂ اضافیت، اور حیات کے امکان جیسے دقیق موضوعات پر قرآن و سائنس کے تقابلی تجزیے کا ایک سنجیدہ مکالمہ ہے۔

سوم، محبت اور عشق، جو انسانی زندگی کا سب سے لطیف اور پیچیدہ جذبہ ہے۔ کیا محبت محض ایک نفسیاتی یا کیمیائی تعامل ہے، یا اس کی جڑیں ازلی حقیقتوں میں پیوست ہیں؟ یہ کتاب عشقِ حقیقی و مجازی کے درمیان باریک حد فاصل پر تفکر کرتی ہے، اور اس امر کی تحقیق کرتی ہے کہ محبت محض انسانی فطرت کا ایک جزو ہے یا روح کی ازلی پیاس؟ قرآنی آیات، صوفیانہ مکاشفے، فلسفیانہ استدلال اور ادبی تخلیقات، سب اس باب میں ایک منفرد امتزاج کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

چہارم، انسان، جو کائنات کی سب سے پیچیدہ اور معمہ خیز مخلوق ہے۔ انسان کی تخلیق، اس کا شعور، اس کا ارتقا، اس کی تقدیر، اور اس کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ کیا انسان ایک ارتقائی حادثہ ہے، یا کائنات کا مقصود؟ قرآن، جدید سائنسی نظریات، اور فلسفیانہ مکاتبِ فکر کے حوالے سے انسان کے ماضی، حال اور مستقبل پر ایک گہرا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری یہ سمجھ سکے کہ انسان اپنی حقیقت میں نہ نور ہے نہ نار، خاکی ہے مگر خاک سے پیدا نہیں ہوا۔

یہ کتاب ان افراد کے لیے نہیں جو سطحی خیالات پر اکتفا کرتے ہیں، بلکہ ان متلاشیانِ حق کے لیے ہے جو جمود کو توڑنے، سوال اٹھانے، اور حقائق کی گہرائی میں اترنے کی جسارت رکھتے ہیں۔ یہ ایک فکری کاوش ہے جو محبت، مذہب، فلسفہ، سائنس اور شاعری کو یکجا کر کے ایک ایسے فکری منظر نامے کو ترتیب دیتی ہے جو قاری کے ذہن کو ایک نئی روشنی عطا کرے۔

یہ کتاب محض معلومات کا مجموعہ نہیں، بلکہ غور و فکر کی ایک دعوت ہے، ایک جستجو ہے، ایک سفر ہے، ایسا سفر جو ممکن ہے قاری کو نئی فکری منازل تک لے جائے، یا کم از کم اسے سوال اٹھانے کا سلیقہ عطا کرے۔ کیونکہ حقیقت وہی ہے جس پر سوالات قائم کیے جا سکیں، اور حکمت وہی ہے جو سوالات کے جوابات دینے سے زیادہ سوالات پیدا کرنے کی جرات رکھتی ہو۔

انتساب

باسمہ تعالی

یہ کتاب میں منسوب کرتا ہوں

اپنے والد فداءُ الحق خٹک (مرحوم) کے نام، جن کی دعاؤں کی تاثیر، تربیت کی بلاغت، اور شفقت کی لازوال ظلال ہمیشہ میرے لیے مایۂ افتخار رہی۔

اپنی والدہ زوجۂ فداءُ الحق خٹک کے نام، جن کی غیر مشروط محبت، ایثار کی معراج، اور عنایاتِ مادرانہ میرے لیے سرمایۂ حیات رہیں۔

اپنے چچا ضیاءُ الحق خٹک کے نام، جن کی نصیحتیں چراغِ راہ، اور جن کا حوصلہ ہمیشہ میرے لیے مژدۂ جاں رہا۔

اپنے بھائی وسیم شہزاد فدا کے نام، جس کی رفاقت، خلوص، اور بے تکلف محبت میرے عزم کی توانائی ہے۔

اپنی بہنوں کے نام، جن کی دعاؤں کی روشنی اور محبت کی حرارت ہمیشہ میری ہم سفر رہی۔

اپنی رفیقۂ حیات کے نام، جس کی ہمراہی نے زندگی کو خوبصورت رنگ دیے اور مجھے ثابت قدم رکھا۔

اپنے قریبی دوستوں کے نام، جو ہر نشیب و فراز میں میرے ساتھ کھڑے رہے،
خلوص، وفا، اور اخلاص کی بہترین مثال بنے۔

اپنے گاؤں خاورئی کے معزز مشران کے نام، جو اپنی بصیرت، غیرت، اور یکجہتی کی علامت ہیں،
اور جنہوں نے ہمیشہ میری ہمت بندھائی۔

اور اپنے اساتذہ کرام کے نام، جن کے علم، رہنمائی اور دعاؤں نے مجھے سوچنے اور لکھنے کی راہ دکھائی۔

اللہ تعالیٰ ان سب ہستیوں کو سلامت رکھے اور اپنے رحم و کرم سے نوازے۔ آمین

دیباچہ

یہ کتاب محض میرے شخصی افکار کی انعکاس نہیں، بلکہ ان غیر مرئی جذبات و احساسات کی ترجمان ہے، جو ہر ذی شعور کے باطن میں مکتوم رہتے ہیں، کبھی زبان پر مہرِ سکوت ثبت کیے رکھتے ہیں، اور کبھی اظہار کے الفاظ کی جستجو میں سر گرداں رہتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ تحریریں متفرق خیالات کی بے سمتی کو ایک فکری سمت عطا کریں گی اور منتشر اذہان کو کسی نہ کسی منزل سے ہمکنار کریں گی۔

یہ فکری و قلمی مسافت، جو محض ایک خیال اور ایک مرکب کی جنبش سے مبدہ ہوئی، ان تمام نفوسِ قدسیہ کی رہینِ منت ہے جنہوں نے مجھے تدبر، تفکر، اور اظہار کی جسارت بخشی۔ میں اپنے والدین، اساتذہ، رفقائے فکر، اور اس خاکِ زرخیز کے ان فرزندانِ دانا کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے ہمیشہ میرے لیے دعا کے چراغ فروزاں رکھے اور حوصلہ افزائی کی شمع روشن رکھی۔

آخر میں، میں اس کتاب کو اُن صاحبانِ دانش کے نام منسوب کرتا ہوں، جو سطحیت سے ماورا ہو کر حیات و کائنات کو ایک بصیرت افروز نگاہ سے دیکھتے ہیں، جو سوال اٹھانے کی جرات رکھتے ہیں، جو محبت کے اسرار و رموز میں حقیقت کی پرتیں تلاش کرتے ہیں، اور جو کائنات کے نہاں گوشوں میں پنہاں معرفت کی کرنوں کے متلاشی ہیں۔

بارگاہِ رب العزت میں دعا ہے کہ یہ کتاب میرے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہو اور ہر اس دل کے نہاں خانے میں جگہ پائے جو نورِ علم و حکمت سے منور ہونے کا آرزومند ہے۔

تقدیرِ نارسائی و سرابِ ہستی

حیات کی پیچ در پیچ راہگزر پر میں ایک ایسے مسافر کی مانند ہوں جو نہ منزل سے آشنا ہے اور نہ ہی راستے کی حقیقتوں سے باخبر۔ ازل سے تقدیر کی مہریں جبینِ کائنات پر ثبت ہیں، مگر انسان اسی لکھی ہوئی تحریر کو بے سود بدلنے کی کوشش میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیتا ہے۔ میری زندگی بھی انہی ناگزیریتوں کا ایک نمونہ ہے، جہاں ہر لمحہ ایک نوشتۂ دیوار کی طرح میرے سامنے منقش رہا۔ میں نے جس چراغ کی لو میں اپنی خواہشات کے گلستاں کو نمو بخشنے کا خواب دیکھا، وہی چراغ صرصرِ حوادث کے ہاتھوں بارہا گُل ہوا۔ میری امیدوں کی عمارتیں جن بنیادوں پر استوار ہوئیں، وہ بنیادیں وقت کی بے رحم آندھیوں میں زمیں بوس ہو گئیں۔

زندگی ایک مسلسل آزمائش ہے، جہاں آرزوئیں گرداب میں محبوس رہتی ہیں اور خواب سراب کی مانند تعاقب کرواتے ہیں۔ میں نے ان گنت شبیں اضطراب کے مہیب سائے میں گزاریں، جہاں تفکر کی سنگلاخ راہوں پر چلتے چلتے میں خود کو ہی کھو بیٹھا۔ علم و آگہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے میں نے جانا کہ شعور ایک زہر ہے، جسے جتنا پیا جائے، اتنی ہی حیات کی تلخی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لاعلمی کی سادہ لوحی، جو کبھی جہالت کہلاتی تھی، بعض اوقات وہی سکون کا باعث بنتی ہے۔ مگر میں نے جس راہ کا انتخاب کیا، وہ ہمیشہ ایک ناآسودہ جستجو کی راہ رہی۔ میں نے کتابوں میں دبے اسرار کھولنے کی کوشش کی، فلسفے کی گتھیوں کو سلجھانے کی سعی کی، منطق کے پرپیچ راستوں پر چلنے کی تمنا کی، مگر جتنا آگے بڑھا، اتنا ہی لاعلمی کا شعور بڑھا۔

دنیاوی محبتوں کی کائنات بھی ایک عجیب ماحصل رکھتی ہے۔ کوئی دل میں بسیرا کر لیتا ہے، کوئی ہجر کی تپتی ریت پر چھوڑ جاتا ہے، اور کوئی فنا کے بحر میں یوں غرق ہو جاتا ہے کہ اس کے وجود کی ہلکی سی بازگشت

بھی باقی نہیں رہتی۔ میں نے چاہا کہ محبت کو کسی ٹھوس قالب میں ڈھالوں، مگر محبت تو ازل سے ہی بے ساختہ، بے صورت اور بے قیاس رہی ہے۔ اسے قید کرنا، کسی مٹھی میں بند کرنا، کسی اصول میں باندھنا ناممکن ہے۔ میں نے یہ سب جان کر بھی اپنی ہستی کو اس کی بھٹی میں جھونک دیا، اور نتیجہ وہی رہا جو ہر مشتِ خاک کا ہوتا ہے—فنا، نارسائی، اور سراب۔ وقت کا جبر بھی ایک المیہ رہا، جو میرے شب و روز پر سایہ فگن رہا۔ میں نے دیکھا کہ لمحے کتنے سفاک ہوتے ہیں، جو بے نیازی سے کٹتے جاتے ہیں، زخموں کو گہرا کرتے ہیں، اور یادوں کو پژمردگی کی دھند میں دبا دیتے ہیں۔ میں ان لمحوں کی گرفت میں ہمیشہ بے بس رہا، چاہا کہ وقت کو تھام لوں، مگر وہ میرے ہاتھوں سے یوں پھسلتا رہا جیسے مٹھی میں بند ریت۔ میں آج بھی اسی حیات کے پیچیدہ طلسم میں مقید ہوں، جہاں ہر دن ایک نئے سوال کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور ہر رات ایک نئے ملال کے ساتھ ڈھلتی ہے۔ میں نے تقدیر سے جنگ کی، مگر شکست مقدر رہی۔ میں نے زندگی کو پانے کی آرزو کی، مگر یہی معلوم ہوا کہ زندگی خود ایک لایعنی معمہ ہے، جس کا حل شاید ازل سے کسی کے پاس نہیں۔ میرے نام کی کوئی اہمیت نہیں، میری داستان کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں بھی ان گنت مسافروں کی طرح ایک ایسا راہی ہوں جس کے قدموں کے نشان وقت کی ریت پر لمحوں میں مٹ جائیں گے۔ شاید یہی زندگی کا سب سے تلخ مگر سب سے بڑا سچ ہے۔

اللہ کے مقام پر فکری تبصرہ

اگر انسانی ادراک کی تمام پرتوں کو یکجا کر دیا جائے، اگر شعور کی تمام تر وسعتوں کو مجتمع کر لیا جائے، اور اگر عقل کی جملہ لطافتوں اور تیز رفتاریوں کو یکسو کر کے کسی ایک مرکز پر مرتکز کر دیا جائے، تب بھی اللہ کے مقام کی حقیقت کا سراغ لگانا محض سراب کے تعاقب کے مترادف ہوگا۔ وہ مقام جو ہر قیاس سے ماورا، ہر گمان سے بالا، اور ہر تشبیہ سے منزّہ ہو، اس پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے صحرا میں دریا کی لہر تلاش کرنا، یا شبِ دیجور میں نور کے ایسے سرچشمے کا جستجو کرنا جسے نگاہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ اللہ کے مقام پر غور کرنا ایک ایسی کوشش ہے جس میں ہر مسافت لاحاصل، ہر جست بے مایہ، اور ہر تحقیق ناتمام۔ یہ مسئلہ انسانی عقل کے لیے اس قدر مہیب اور پرپیچ ہے کہ اس پر سوچنے والے کئی ذہن یا تو سرگرداں ہو گئے، یا پھر نطق سے محروم ہو کر صمت کی قبر میں دفن ہو گئے۔ جو ذات مکانی قیود سے آزاد، زمانی تعینات سے بے نیاز، اور مادی محصورات سے منزّہ ہو، اس کے مقام کی تعین کیسے ممکن ہو؟

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ تدبر ہے کہ جب ہم لفظ مقام ادا کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ذہن میں ایک فضائی، زمانی، یا مکانی حد کا تصور ابھرتا ہے، جبکہ اللہ ہر حد، ہر قید، اور ہر تعین سے ماورا ہے۔ پس، یہاں مقام کا مفہوم بھی وہ نہیں جو عام فہم میں استعمال ہوتا ہے، بلکہ وہ ایک ایسی غیر محسوس حقیقت ہے جسے انسانی حواس کی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔

کیا اللہ کا مقام عرش ہے؟ اگر ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عرش خود کسی مکان میں ہے؟ اور اگر مکان میں ہے تو وہ مکان کیا ہے، اور اس کا خالق کون ہے؟ اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ عرش پر مستوی ہے، تو

پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا عرش کی کوئی سمت ہے؟ اور اگر کوئی سمت ہے تو اللہ کسی ایک سمت میں محدود ہو گیا؟ نہیں، وہ اس سے بلند تر ہے، وہ کسی ایک حد میں سمانے والا نہیں۔

یہاں انسانی فکر کو ایک اور گتھی درپیش ہوتی ہے، کیا اللہ کا مقام اس کی ذات کے علاوہ کچھ ہے؟ اگر مقام کوئی خارجی حقیقت ہے تو کیا وہ مقام اللہ کا محتاج ہوا، یا اللہ اس مقام کا محتاج؟ اور اگر اللہ خود کسی مکان کا محتاج نہیں، تو پھر مقام کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اگر وہ ہر جگہ ہے، تو کیا وہ جگہوں میں تقسیم ہو گیا؟ اور اگر کسی ایک جگہ نہیں، تو پھر کیا وہ عدم میں ہے؟ نہیں، وہ وجودِ مطلق ہے، مگر اس کے وجود کی نوعیت مخلوق کی مانند نہیں، کہ وہ کسی مادی یا مکانی حد میں سمایا جا سکے۔

یہ مسئلہ انسانی عقل کے لیے ایسا ہی پیچیدہ ہے جیسا کہ لامتناہی کو متناہی میں سمانے کی کوشش کرنا۔ انسان جب بھی کسی شے کا تصور کرتا ہے، وہ اسے کسی نہ کسی جہت، کسی نہ کسی پیرائے، یا کسی نہ کسی تمثال میں ڈھال کر سوچتا ہے، اور یہی اس کی فکری محدودیت کا ثبوت ہے۔ اللہ کے مقام پر سوچنے والا ہر ذہن بالآخر اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جتنا زیادہ سوچا، اتنا ہی زیادہ حیرت میں اضافہ ہوا، جتنی زیادہ تحقیق کی، اتنا ہی زیادہ راستہ دھندلا ہوتا گیا، اور جتنا زیادہ آگے بڑھا، اتنا ہی زیادہ جہل کا احساس ہوا۔

یہاں وہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کا مقام وہی جان سکتا ہے جسے اللہ خود اس راز میں داخل کر دے۔ عام ذہن اس مسئلے پر سوچنے کی جسارت کرے تو یا تو وہ عقل کے بھنور میں پھنس جائے، یا پھر خام خیالی کے صحرا میں بھٹک جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے پر خاموشی بھی ایک حکمت ہے، اور غور و فکر بھی ایک حیرت انگیز مہم جوئی۔

پس، وہ جو ہر چیز کا مالک ہے، جو ہر ذرّے میں جلوہ گر ہے، جو ہر حقیقت کی بنیاد ہے، اس کا مقام کسی ایک حد میں قید نہیں ہو سکتا۔ وہ بلندیوں میں ہے، مگر کسی بلندی کا محتاج نہیں، وہ نزدیکی میں ہے، مگر کسی

قرب و بعد کا محتاج نہیں، وہ ہر شے کو محیط ہے، مگر خود کسی محیط میں محدود نہیں۔ اس پر سوچنا بھی ایک معمہ، اور اس کا ادراک بھی ایک ناممکن جستجو ہے۔

اللہ کی ذات وجود میں کیسے آئی؟

یہ سوال کہ "اللہ کی ذات وجود میں کیسے آئی؟" ایک ایسا فکری معمہ ہے جو عقلِ انسانی کے لیے ہمیشہ باعثِ حیرت و استعجاب رہا ہے۔ یہ وہ عقدہ ہے جس نے فلاسفہ کی فکری مسندوں کو لرزا دیا، متکلمین کے استدلالی قلعوں کو متزلزل کیا، اور منطقیوں کی موشگافیاں اس کے سامنے دم توڑتی رہیں۔ مگر اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو حقیقتِ مطلقہ کو مادی قیود سے آزاد کر کے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہاں عقلِ انسانی کا بنیادی مغالطہ یہ ہے کہ وہ ہر وجود کو کسی علت کا محتاج سمجھتی ہے۔ جو شے عدم سے وجود میں آتی ہے، وہ بلاشبہ کسی موجد، کسی صانع، کسی علتِ اولیٰ کی محتاج ہوتی ہے۔ مگر جو وجود ہر علت سے ماورا، ہر سبب سے بلند تر، اور ہر امکان سے بے نیاز ہو، وہ کسی ظہور، کسی نمود، کسی ابتداء کا پابند کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ وہ حقیقتِ ازلیہ ہے جو ہر جہت سے خود موجود، ہر حیثیت میں خود قائم، اور ہر وسوسۂ عقل سے بلند تر ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی فکر اپنی نارسائی پر محوِ ماتم ہو جاتی ہے۔ جو ذات ازل سے موجود ہو، جس پر عدم کا کوئی سایہ نہ پڑا ہو، جس کے وجود کا کوئی نقطۂ آغاز نہ ہو، اس کے بارے میں، وہ کیسے وجود میں آیا؟ جیسے سوال کا اٹھنا ہی فکری بے سمتی کی دلیل ہے۔ عقل کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالق اور مخلوق کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ مخلوق کا وجود عدم سے نکلتا ہے، وہ محتاجِ علت ہوتی ہے، مگر خالقِ حقیقی اپنی ذات میں خود قائم، خود موجود، اور ہر قسم کے امکان سے بالاتر ہے۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اللہ کو کسی اور نے پیدا کیا، تو وہ ہستی جو اسے وجود میں لائی، خود کس کے ذریعے پیدا ہوئی؟ اگر وہ بھی کسی اور کی محتاج نکلی، تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا، اور ایک ایسا تسلسل قائم ہو جائے گا جو کسی بھی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وہ منطقی مغالطہ ہے جس سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کو واجب الوجود مانا جائے — یعنی وہ ذات جس کا ہونا لازم ہے، جو خود کسی کی محتاج نہیں، بلکہ ہر موجود اسی کی محتاجگی میں قائم ہے۔

یہاں عقل کو ٹھہر کر یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ وجود کا مفہوم اللہ کے لیے وہ نہیں جو مخلوق کے لیے ہے۔ مخلوق کا وجود تغیر پذیر ہے، وہ زمان و مکان کے تحت ہے، اس میں کمی بیشی ممکن ہے، وہ فنا کے دہانے پر کھڑی ہے۔ مگر اللہ کا وجود تغیر، کمی، زیادتی، فنا، حدوث، اور تمام زمانی و مکانی قیود سے منزّہ و ماورا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ موجود ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی جہت میں، کسی مکان میں، کسی خاص حال میں موجود ہے، بلکہ وہ وہی ہے جس کے بغیر کوئی شے موجود ہو ہی نہیں سکتی۔

اگر اللہ نہ ہوتا، تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ کوئی حقیقت، کوئی امکان، کوئی وجود، کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے ہونے کی گواہی دے رہا ہے، ہر وجود اسی کے وجود کی دلیل ہے، اور ہر حقیقت اسی کے نور سے روشن ہے۔ وہ ہر امکان کی اساس، ہر حقیقت کی جڑ، اور ہر موجود کی بقا کا واحد مرکز ہے۔

پس، وہ جوہر علت سے بے نیاز، ہر سوال سے بلند، اور ہر قیاس سے بلند تر ہے، اس پر، وہ کیسے پیدا ہوا؟ کا سوال کرنا ہی جہالت کی دلیل ہے۔ اللہ کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو نہ یہ کائنات ہوتی، نہ یہ نظام ہوتا، نہ شعور ہوتا، نہ عقل ہوتی، نہ سوالات پیدا ہوتے، نہ جوابات کی جستجو ممکن ہوتی۔ وہی ہے جو ہر سوال کا جواب، ہر حقیقت کا سرچشمہ، اور ہر وجود کا مرکز ہے۔ وہ ازل سے ہے، اور ابد تک رہے گا، بے مثل، بے نیاز، بے قیاس، بے حدود۔

اللہ کے وجود کا تصور، ایک فکری و ادبی تجزیہ

یہ سوال کہ اللہ کیسا ہوگا؟، وہ دکھائی کیسے دے گا؟ اور کیا انسان اس کا جلوہ دیکھنے کی تاب رکھتا ہے؟ ایک ایسا معمّہ ہے جس کے گرد عقلِ انسانی صدیوں سے محوِ گردش ہے، مگر ہر گردش بالآخر حیرت و استعجاب کے گرداب میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف فلسفیانہ غور و فکر کا نکتۂ عروج ہے بلکہ ادراکِ بشری کے لیے ایک ایسی حدِ فاصل بھی ہے جہاں سے آگے ہر تصور راکھ بن کر بکھر جاتا ہے۔

یہاں عقل کو دو بنیادی نکتوں کا سامنا ہے، اول، کیا اللہ کا کوئی محسوس اور متعین تصور قائم کیا جا سکتا ہے؟ دوم، اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کس حد تک انسانی فکر میں سمٹ سکتا ہے؟ مگر جیسے ہی ذہن اس جستجو میں قدم رکھتا ہے، اسے شعور کی بے بسی کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ انسانی ادراک کے لیے کوئی بھی چیز اس وقت قابلِ فہم ہوتی ہے جب وہ کسی نہ کسی محسوس پیرائے میں ڈھل سکے، کسی ہیئت، کسی شکل، کسی کیفیت یا کسی جہت میں سمائی جا سکے۔ مگر اللہ کے لیے کوئی شکل، کوئی جسم، کوئی رنگ، کوئی قیاس نہیں، وہ ہر حد، ہر قیود، ہر جہت سے منزّہ ہے۔ پس، اس کا تصور کرنے کی ہر سعی محض وہم کی خیالی عمارتیں ہیں جو حقیقت کے معیار پر قائم نہیں رہ سکتیں۔

کیا اللہ دکھائی دے گا؟

یہ سوال بذاتِ خود ایک فکری دھوکہ ہے۔ دیکھنا ایک ایسا عمل ہے جو مادی دنیا میں بصارت کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ مگر جو ذات مادی قید سے آزاد، زمانی و مکانی قیود سے بے نیاز، اور نور و ظلمت کی ثنویت سے ماورا ہو، اس کے دیکھنے کا مفہوم بھی وہ نہیں جو انسان اپنے حواس سے منسلک کر کے سمجھتا ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیسے؟ اگر آنکھ سے، تو کیا وہ آنکھ کی پہنچ میں آ سکے گا؟ اور اگر کسی اور ادراک کے ذریعے، تو وہ ادراک کس نوعیت کا ہوگا؟ اگر اللہ کسی خاص صورت میں جلوہ گر ہوتا تو کیا وہ محدود نہ ہو جاتا؟ اور اگر محدود ہوتا، تو کیا وہ اللہ رہتا؟

یہیں پر انسانی ادراک کو اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اللہ کا جلوہ نہ روشنی کی مانند ہے کہ آنکھیں اسے دیکھ سکیں، نہ کوئی مادی شے ہے کہ ہاتھ اسے چھو سکیں، نہ کوئی صدا ہے کہ کان اسے سن سکیں۔ وہ ان سب سے وراء الوراء ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، جبکہ وہ سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ پس، اللہ کا جلوہ مادی آنکھوں کی گرفت میں آنا ممکن نہیں، کیونکہ آنکھیں محدود ہیں، اور وہ لامحدود۔

انسان کو اللہ کا جلوہ کب دکھائی دے گا؟

یہ سوال بھی اپنی نوعیت میں فکری حیرتوں سے لبریز ہے۔ اگر کوئی انسان یہ سوچے کہ وہ اسی دنیا میں اللہ کو دیکھ لے گا، تو وہ محض خیالی دنیا میں بسر کر رہا ہے۔ مادی وجود میں رہتے ہوئے، جسمانی آنکھوں سے اللہ کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی قطرہ یہ خواہش کرے کہ وہ پورے سمندر کو اپنی گہرائی میں جذب کر لے۔

اللہ کا جلوہ دیکھنے کے لیے وہی آنکھ درکار ہے جو حجابِ مادیت سے بالکل پاک ہو، جو کسی محدود زاویے کی محتاج نہ ہو، جو نورِ محض کی تمازت کو سہنے کی استعداد رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہیں طورِ سینا پر ایک تجربہ عطا کیا گیا—اور جب اللہ نے پہاڑ پر اپنا

نور ڈالا، تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا، اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ایک بے جان پہاڑ اس تجلی کی تاب نہ لا سکا، تو گوشت و پوست میں لپٹا ہوا انسان کیسے اس جلوے کا سامنا کر سکتا ہے؟

اگر اللہ کا جلوہ دیکھنا ہے، تو اس کے لیے ایک مختلف سطح کا وجود درکار ہوگا، وہ وجود جو مادی پابندیوں سے آزاد ہو، جو زمانی و مکانی حدود سے نکل چکا ہو، جو نور کے ان لطیف پردوں کو چاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جن کے اس طرف حقیقتِ مطلقہ کی تجلیات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اللہ کا تصور، حقیقت یا محض قیاس؟

یہاں عقل ایک اور فکری دوراہے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ کو نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ اس کی کوئی متعین صورت سوچی جا سکتی ہے، تو پھر اس کا تصور کیا محض ایک قیاس ہے؟ نہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اللہ کا تصور، اس کے ادراک کی حد میں نہ آنے کے باوجود، ایک ایسی بدیہی سچائی ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر ذی شعور کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے، ایک ایسا یقین جو الفاظ کا محتاج نہیں۔

یہ وہ احساس ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں سمویا ہوا ہے، وہ ادراک ہے جو کسی دلیل کا پابند نہیں، وہ نور ہے جو عقل سے ماورا ہو کر دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ اللہ کا تصور کسی ایک شکل میں محدود نہیں ہو سکتا، مگر وہ ہر وجود کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ کہیں نہیں، مگر ہر جگہ ہے؛ وہ دکھائی نہیں دیتا، مگر ہر حقیقت میں نظر آتا ہے؛ وہ حواس کی دسترس سے باہر ہے، مگر ہر لمحہ دل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتا ہے۔

پس، جو اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرے، وہ الجھ جائے گا؛ جو اسے دیکھنے کی جسارت کرے، وہ گمراہ ہو جائے گا؛ مگر جو اسے محسوس کرے، وہ اپنے اندر ایک ایسی روشنی پائے گا جو الفاظ کی قید سے آزاد، دلائل کی محتاجی سے بے نیاز، اور ہر قیاس سے برتر ہے۔

وجودِ الٰہی اور انسانی شعور، ایک فکری محاکمہ

جب کائنات کے اسرار پر غور کیا جاتا ہے، جب زندگی کے معانی کی پرتیں کھولی جاتی ہیں، جب وجود اور عدم کی بحث اپنی انتہا کو پہنچتی ہے، تو ایک ایسا سوال جنم لیتا ہے جو انسانی ذہن کو مضطرب کیے رکھتا ہے، اگر اللہ موجود ہے، تو شعورِ انسانی کو اس کے ادراک میں کیوں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اگر وہ حقیقتِ مطلقہ ہے، تو کیوں انسانی ذہن اس کے فہم سے قاصر رہتا ہے؟

یہ مسئلہ محض ایک فلسفیانہ بحث نہیں بلکہ شعور و ادراک کی سرحدوں کا وہ نکتہ ہے جہاں عقل کے پر جلنے لگتے ہیں اور معرفت کے اسرار ایک نئے جہان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انسانی شعور کی اپنی ایک ساخت ہے، ایک حدود و قیود ہیں، ایک پیرایۂ ادراک ہے، اور یہ سب مادی اور زمانی قیود کے تابع ہیں۔ ہر وہ حقیقت جو انسان کے حواس کی گرفت میں آتی ہے، وہ کسی نہ کسی پیرائے میں محسوس کی جاتی ہے، یا وہ دیکھی جاتی ہے، یا سنی جاتی ہے، یا چکھی جاتی ہے، یا چھوئی جاتی ہے۔ مگر جو حقیقت ان تمام حواس سے ماورا ہو، جو کسی جہت میں مقید نہ ہو، جو کسی بھی محسوس شکل میں نہ سمائے، وہ انسانی شعور کے دائرۂ فہم میں کیسے داخل ہو سکتی ہے؟

یہاں پر ہمیں انسانی ادراک کی کمزوری اور محدودیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی فکری روایات کے اسیر، اپنی عقلی ساخت کے محتاج، اور اپنے تجرباتی سانچوں میں محصور ہیں۔ اللہ کے شعور کو پانے کے لیے وہی

عقل درکار ہے جو اپنی مادی قیود سے آزاد ہو، وہی ذہن درکار ہے جو زمانی و مکانی جال سے نکل چکا ہو، وہی فہم درکار ہے جو محسوسات کی سرحدوں سے گزر کر حقیقتِ مطلقہ کے نور میں جذب ہو سکتا ہو۔

شعورِ انسانی اور حقیقتِ مطلقہ کے درمیان حجاب

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ موجود ہے، تو انسان کو اس کے ہونے کا براہِ راست شعور کیوں حاصل نہیں؟

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے، شعورِ انسانی کا ایک مخصوص زاویہ ہے، ایک محدود جہت ہے۔ انسانی ذہن کائنات کو ایک خاص انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کا عادی ہے۔ وہ مادے، وقت، اور مکان کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ جو کچھ جانتا ہے، وہ یا تو اس نے تجربہ کیا ہے، یا کسی ذریعے سے سیکھا ہے، یا کسی قیاس پر مبنی ہے۔ مگر اللہ کا تصور کسی تجربے میں نہیں آ سکتا، کسی استدلالی سانچے میں نہیں سما سکتا، کسی قیاس میں نہیں لپیٹا جا سکتا۔ وہ تمام ممکنہ حد بندیوں سے آزاد ہے، اس لیے اس کا براہِ راست شعور حاصل کرنا انسانی عقل کے بس میں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے شعور کے درمیان ایک ایسا حجاب ہے جو حقیقت اور مظاہر کے درمیان ایک ناقابلِ عبور سرحد قائم کر دیتا ہے۔ جب انسان اپنے فطری شعور سے اللہ کے وجود کو پانے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ ان حجابوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اللہ کا شعور کسی حسی ادراک یا عقلی استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قلب کی گہرائیوں میں نورِ یقین بن کر اترتی ہے۔

شعور اور تجلی، کیا اللہ کا شعور حاصل کیا جا سکتا ہے؟

اگر انسانی ذہن اللہ کے ادراک سے قاصر ہے، تو پھر کیا یہ ممکن ہے کہ شعورِ انسانی کسی ایسے درجے پر پہنچے جہاں اسے اللہ کے ہونے کا براہِ راست احساس ہو؟

یہ وہ نکتہ ہے جہاں عقل و معرفت کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے۔ عقل ہر چیز کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے کسی خارجی وسیلے کی محتاج ہوتی ہے، مگر معرفت کی راہ وہ ہے جہاں حقیقت خود شعور پر جلوہ گر ہوتی ہے، جہاں حجاب اٹھتے ہیں، جہاں انسانی ذہن اپنے فطری قیود کو توڑ کر ایک ایسی وسعت میں داخل ہوتا ہے جہاں حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔

یہی وہ لمحہ ہے جب شعور کو اللہ کے ہونے کا ایسا یقین حاصل ہو جاتا ہے جو کسی دلیل کا محتاج نہیں رہتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں یقین، استدلال کی بیساکھیوں سے آزاد ہو کر ایک حتمی حقیقت بن جاتا ہے۔ یہاں کوئی سوال باقی نہیں رہتا، کوئی تشکیک باقی نہیں رہتی، کوئی مغالطہ باقی نہیں رہتا، صرف ایک ایسا یقین باقی رہتا ہے جو ہر شے سے زیادہ واضح، ہر دلیل سے زیادہ مضبوط، اور ہر حقیقت سے زیادہ قائم ہے۔

شعور اور حقیقت کی نارسائی

انسانی عقل، اپنے تمام تر جلال و جمال کے باوجود، حقیقتِ مطلقہ کو پوری طرح گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ یہ حقیقت عقل سے بلند ہے، یہ فہم سے ماورا ہے، یہ سوچ کی سرحدوں سے پرے ہے۔ مگر وہ جو اپنی عقل کو اس حقیقت کی طرف موڑ دیتا ہے، وہ ایک ایسے سفر پر نکلتا ہے جہاں ہر قدم پر حیرت، ہر منزل پر عرفان، اور ہر تجربے میں ایک نئی تجلی پوشیدہ ہوتی ہے۔

اللہ کا شعور انسانی عقل کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے، ایک ایسی جستجو ہے جس کا اختتام ممکن نہیں، ایک ایسا راز ہے جو ہر لمحہ مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب انسانی ذہن حقیقتِ مطلقہ کے ادراک کی سعی میں محو ہوتا ہے، تو وہ بالآخر ایک ایسے سوال سے دوچار ہوتا ہے جو فکر کی وسعتوں کو مزید کشادہ کر دیتا ہے، اگر اللہ ہر شے کا خالق ہے، تو اس کی تخلیق کی وسعت کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل ایک نئے جہان میں داخل ہوتی ہے، جہاں مشاہدۂ حقیقت کی جستجو، کائنات کے سربستہ رازوں کی کھوج میں بدل جاتی ہے۔

یہ عالمِ ہست و بود، یہ بسیط کہکشائیں، یہ دور دراز کہکشانی جھرمٹ، یہ بلیک ہولز کے عمیق اندھیرے، یہ ستاروں کے جنم اور موت کے حیرت انگیز مناظر، یہ سب دراصل اسی حقیقت کی نشانیاں ہیں جسے شعورِ انسانی اپنی نارسائی کے باوجود سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب اللہ کی ذات پر غور و فکر کا سفر اپنے عروج کو پہنچتا ہے، تو ایک نئی جہت کھلتی ہے، یہ کائنات کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس کی انتہائیں کہاں تک ہیں؟ اور یہ سب کچھ کیوں اور کیسے وجود میں آیا؟

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی حقیقت کو فلکی بیکراں وسعتوں میں تلاش کرتا ہے، جہاں زمین کی حقارت، آسمان کی رفعت، ستاروں کی زندگی، اور کہکشاؤں کی بے پایاں گردشیں ایک نئے فکری سفر کا نقطۂ آغاز بنتی ہیں۔ اب سوال ذاتِ الٰہی سے نکل کر اس کے تخلیقی شاہکاروں تک جا پہنچتا ہے، اور مشاہدۂ فلک، غور و فکر کی اگلی منزل بن جاتا ہے۔

کائنات اور فلکیات

کائنات ایک لامحدود، پیچیدہ اور مسلسل وسعت پذیر حقیقت ہے، جس کی پہنائیاں انسانی فہم و ادراک کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہیں۔ ازمنۂ قدیم میں انسان اپنی محدود بصیرت کے سبب زمین کو کائنات کا محور گردانتا رہا، مگر جیسے جیسے علمِ فلکیات نے نئی راہیں ہموار کیں، ویسے ویسے حقیقت کے پردے چاک ہوتے گئے۔ اب یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ زمین محض ایک ناچیز ذرہ ہے، جو اربہا کہکشاؤں کے بے کنار سمندر میں گمشدہ ہے، اور انسانی وجود، جو کبھی کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا، حقیقت میں محض ایک لطیف امکان کی مانند ہے، جو ازل سے جاری اس عظیم الشان نظام کا محض ایک حقیر جزو ہے۔

ایک حیران کن حقیقت

ماہرین فلکیات کے مطابق، کائنات کی ابتدا ایک مہیب کائناتی انفجار کے نتیجے میں ہوئی جسے جدید سائنس عظیم دھماکہ قرار دیتی ہے۔ یہ تصور کسی قیاس آرائی پر مبنی نہیں بلکہ فلکیاتی مشاہدات اور طبیعیاتی قوانین کی روشنی میں ثابت شدہ حقیقت ہے۔ قرآن بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آسمان و زمین ایک اکائی تھے جنھیں بعد ازاں جدا کیا گیا۔ آج جدید سائنس اسی نظریے کی تصدیق کرتی ہے کہ ابتدائی کائنات انتہائی کثیف اور گرم تھی جو ایک دھماکے کے بعد مسلسل پھیلاؤ کی جانب گامزن ہوئی۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

کیا وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین بند تھے، پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا، پھر کیا وہ ایمان نہیں لاتے، سورہ الانبیاء، آیت 30

یہ کائنات ہر لمحہ وسعت پذیر ہے جسے ایک معروف سائنس دان نے بیسویں صدی میں مشاہدات کی روشنی میں ثابت کیا۔ کہکشائیں نہ صرف ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں بلکہ یہ پھیلاؤ ایک مسلسل عمل ہے۔ قرآن میں بھی کائنات کی اس حیران کن وسعت کی طرف اشارہ موجود ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور بے شک ہم ہی اسے وسعت دینے والے ہیں، سورہ الذاریات، آیت 47

جدید سائنسی مشاہدات کے مطابق اب تک تقریباً دو کھرب کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں اور ہر کہکشاں میں اربوں ستارے موجود ہیں۔ ہماری اپنی کہکشاں ملکی وے میں تقریباً چار سو ارب ستارے موجود ہیں جن میں ہمارا سورج بھی شامل ہے۔ حیرت انگیز طور پر وہ روشنی جو ہم آج کسی دور دراز کہکشاں سے موصول کر رہے ہیں حقیقت میں اربوں سال پہلے خارج ہو چکی تھی اور اب ہم ماضی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور تمھیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور تمھاری اپنی پیدائش میں بھی بہت سی نشانیاں دی گئی ہیں، مگر تم غور نہیں کرتے، سورہ الجاثیہ، آیت 13

ایک ذرہ یا اشرف المخلوقات؟

جب ہم کائنات کی اس وسعت کو دیکھتے ہیں تو ایک سوال ابھرتا ہے انسان کی اس وسیع کائنات میں کیا حقیقت ہے؟

ظاہری طور پر، انسان ایک معمولی وجود لگتا ہے، جو ایک چھوٹے سے سیارے پر بستا ہے، جو خود ایک عام سے ستارے کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ سورج ایک بڑی کہکشاں کا چھوٹا سا حصہ ہے، اور یہ کہکشاں بھی اربوں کہکشاؤں میں سے صرف ایک ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انسان کی حقیقت کسی ذرّے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی، مگر کیا حقیقت صرف مادی پیمانوں پر ماپی جا سکتی ہے؟

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور ہم نے زمین و آسمان کو کھیل تماشے کے لیے پیدا نہیں کیا، سورہ الدخان، آیت 38

یعنی اس کائنات کی تخلیق ایک عظیم حکمت کے تحت ہوئی ہے، اور انسان کو یہاں بے مقصد نہیں بھیجا گیا۔

علم کہتا ہے کہ کائنات میں بے شمار کہکشائیں اور سیارے موجود ہیں، مگر اب تک زندگی کی علامات صرف زمین پر ملی ہیں، جو اسے ایک منفرد اور خاص مقام عطا کرتی ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے، انسان محض گوشت پوست کا جسم نہیں، بلکہ شعور، جذبات، تخیل اور حکمت رکھنے والا مخلوق ہے۔ وہ کائنات کے بارے میں سوال اٹھاتا ہے، اس کے راز جاننے کی کوشش کرتا ہے، اور یہی چیز اسے عام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔

کائنات کی وسعت اور انسان کی عظمت

اگرچہ مادی پیمانے پر انسان ایک ذرہ معلوم ہوتا ہے، مگر علم، شعور اور روحانی بصیرت کے لحاظ سے وہ ایک غیر معمولی مخلوق ہے۔ انسان کے ذہن میں یہ وسعت ہے کہ وہ پوری کائنات کا تصور کر سکتا ہے، اس کے قوانین دریافت کر سکتا ہے، اور اسے سمجھنے کی جستجو کر سکتا ہے۔ انسان کی روح میں یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے محدود جسم میں قید ہونے کے باوجود لامحدود حقیقتوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ انسان کا علم اور فہم اسے ستاروں اور کہکشاؤں سے بھی زیادہ باوقار بناتا ہے، اور یہی اس کی حقیقت ہے۔ کائنات کی بے پناہ وسعت انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ غرور اور تکبر سے بچے، کیونکہ وہ ایک معمولی سی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن ساتھ ہی، یہ وسعت اس بات کا اشارہ بھی دیتی ہے کہ انسان کوئی عام مخلوق نہیں، بلکہ وہ شعور، حکمت، اور جستجو کا حامل ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو اسے کہکشاؤں سے بھی زیادہ قیمتی بناتا ہے۔

یہاں انسان کے لیے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے

"اگر میں اس وسیع کائنات میں محض ایک ذرہ ہوں، تو میرا مقصد کیا ہے؟"

یہی وہ سوال ہے جس کا جواب دین، فلسفہ اور علم کی روشنی میں تلاش کرنا ہی حقیقی معرفت کی راہ ہے۔

نظامِ شمسی اور کہکشائیں

کائنات کی وسیع تر وسعتوں میں، ستارے اور کہکشائیں بنیادی اکائیاں ہیں، جن میں ہمارا نظامِ شمسی بھی شامل ہے۔ اگرچہ کہکشائیں اربوں ستاروں پر مشتمل ہوتی ہیں، لیکن ہمارا نظامِ شمسی محض ایک کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

کائناتی نظم اور توازن

نظامِ شمسی، سورج کے گرد محوِ گردش مختلف سیاروں، چاندوں، سیارچوں اور شہابیوں پر مشتمل ایک پیچیدہ مگر نہایت منظم ساخت رکھتا ہے۔ یہ پورا نظام ایک ایسے توازن کے تابع ہے، جو فطرت کے غیر متزلزل قوانین کی گواہی دیتا ہے۔ قرآن بھی اس فلکی نظم پر روشنی ڈالتا ہے کہ سورج اور چاند ایک مقررہ حساب کے تحت چل رہے ہیں، جس میں کسی بے ترتیبی یا خلل کی گنجائش نہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے، یہ اس غالب اور علم والے کی تقدیر ہے۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے، اور ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے، سورہ یٰسین، آیات 38-40

توانائی کا مرکز

سورج، جو اس عظیم نظام کا محور ہے، اپنے اندر بے پناہ توانائی رکھتا ہے۔ ہائیڈروجن کے جوہری امتزاج کے باعث یہاں مسلسل حرارت اور روشنی پیدا ہو رہی ہے، جس کے بغیر زمین پر زندگی ممکن نہ ہوتی۔ سورج کا قطر تیرہ لاکھ نوے ہزار کلومیٹر ہے، جو زمین سے سو گنا سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجہ حرارت بیرونی سطح پر تقریباً چھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ اور مرکز میں ڈیڑھ کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ تک جا پہنچتا ہے۔ یہ

آتشیں کرہ پورے نظامِ شمسی کو اپنی کشش کے حصار میں لیے ہوئے ہے اور تمام سیارے اسی کے گرد گردش کر رہے ہیں، جو اس کے نظام کی پائیداری کا ثبوت ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور ہم نے ایک چراغ (سورج) بنایا جو روشن ہے، سورہ النباء، آیت 13

زمین اور دوسرے سیارے

نظامِ شمسی میں آٹھ بڑے سیارے شامل ہیں، جو سورج کے گرد مختلف فاصلے پر گردش کر رہے ہیں

عطارد، سب سے چھوٹا اور سورج کے قریب ترین سیارہ

زہرہ، زمین سے مشابہت رکھنے والا مگر شدید گرم سیارہ

زمین، زندگی کا واحد معلوم مسکن، جہاں پانی اور مناسب درجہ حرارت موجود ہے

مریخ، سرخ سیارہ، جہاں زندگی کے امکانات پر تحقیق جاری ہے

مشتری، سب سے بڑا سیارہ، جس کے گرد 90 سے زائد چاند گردش کر رہے ہیں

زحل، اپنے خوبصورت حلقوں کی وجہ سے مشہور، جو برف اور گرد کے ذرات پر مشتمل ہیں

یورینس، ایک منفرد سیارہ جو اپنی محوری گردش میں جھکا ہوا ہے

نیپچون، سب سے دور، سرد ترین اور تیز ہواؤں والا سیارہ

فلکیاتی حقیقت اور انسان کی حیثیت

یہ تمام اجرامِ فلکی ایک عظیم الشان نظم کا حصہ ہیں، جن میں نہ کوئی بے ترتیبی ہے، نہ ہی کوئی خلا۔ انسان جب اس وسیع نظام پر غور کرتا ہے، تو اپنی حقیقت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قرآن اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق انسان کی تخلیق سے کہیں زیادہ بڑی ہے، مگر اکثر لوگ اس پر غور نہیں کرتے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، سورہ آل عمران، آیت 190

یہ نظامِ شمسی اور یہ کہکشانی وسعتیں انسان کو اس کی حیثیت یاد دلاتی ہیں کہ وہ محض ایک عارضی اور محدود وجود ہے، جبکہ کائنات اپنے خالق کی بے پایاں عظمت کا مظہر ہے۔

کہکشاؤں کا پھیلاؤ اور کائنات کی توسیع

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور جا رہی ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ یہ نظریہ اس عظیم دھماکے کی تصدیق کرتا ہے جس سے کائنات کا آغاز ہوا تھا۔ نظامِ شمسی ایک منفرد اور حیرت انگیز توازن کے ساتھ چل رہا ہے، اور ہمارا سیارہ زمین اس توازن کا سب سے اہم حصہ ہے، جہاں زندگی پنپ رہی ہے۔ دوسری طرف، کہکشائیں کائنات کی

وسعت اور اسرار کو مزید گہرا کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک عظیم حکمت کی نشاندہی کرتا ہے، اور انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس عظیم کائنات میں کیوں ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔

ستاروں کی پیدائش اور انجام

کائنات میں ستارے وہ عظیم وشان چراغ ہیں جو اپنی روشنی سے کہکشاؤں کو منور کرتے ہیں۔ یہ کائناتی فیکٹریاں نہ صرف روشنی اور توانائی مہیا کرتی ہیں بلکہ ان ہی کے اندر وہ بنیادی عناصر تشکیل پاتے ہیں، جو زندگی اور سیاروں کی تخلیق کے لیے ضروری ہیں۔ مگر ہر ستارہ ہمیشہ کے لیے نہیں رہتا۔ یہ ایک مخصوص مدت تک روشنی بکھیرنے کے بعد اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے، جو اس کے حجم اور کمیت پر منحصر ہوتا ہے۔

ستاروں کی پیدائش اور گیس و گرد کا امتزاج

ستارے ایک مخصوص عمل کے تحت پیدا ہوتے ہیں، جو کہکشاؤں میں گیس اور گرد کے بادلوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان بادلوں کو نیبولا کہا جاتا ہے۔ جب یہ بادل کسی بیرونی جھٹکے (جیسے کسی قریبی سپر نووا دھماکے) کی وجہ سے سکڑنے لگتے ہیں تو ان کے اندر موجود ہائیڈروجن گیس آپس میں جڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے یہ گیس مزید دبتی ہے، اس کا درجہ حرارت اور دباؤ بڑھتا ہے۔ ایک خاص حد پر پہنچ کر، ہائیڈروجن کے جوہری مرکز آپس میں جڑ کر ہیلیم میں تبدیل ہونے لگتے ہیں، اور توانائی کی ایک زبردست مقدار خارج ہوتی ہے۔ یہی عمل جوہری امتزاج کہلاتا ہے، جو ستارے کے اندر روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔

روشنی اور توانائی کا سفر

ہر ستارہ اپنی زندگی کے دوران مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ مراحل اس کے ابتدائی حجم اور کمیت پر منحصر ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور درمیانے سائز کے ستارے (جیسے سورج) یہ اربوں سال تک ہائیڈروجن کو ہیلیم میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ جب ان کے اندر موجود ہائیڈروجن ختم ہونے لگتی ہے تو یہ سوجھ کر سرخ دیو بن جاتے ہیں۔ آخر میں یہ اپنی بیرونی پرتوں کو خارج کر کے سفید بونا میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جو آہستہ آہستہ مدھم ہو کر کالا بونا بن جاتے ہیں۔

بڑے ستارے

یہ بہت زیادہ توانائی خارج کرتے ہیں اور ان کا زندگی کا دورانیہ کم ہوتا ہے۔ جب ان کا ایندھن ختم ہوتا ہے تو یہ ایک عظیم دھماکے سے پھٹ جاتے ہیں، جسے سپرنووا کہا جاتا ہے۔ اس دھماکے کے بعد، اگر ستارہ زیادہ کمیت والا ہو تو یہ نیوٹران ستارہ یا سیاہ شگاف بن سکتا ہے۔

ایک کائناتی دھماکہ

جب ایک بڑا ستارہ مرتا ہے، تو وہ ایک زبردست دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ یہ دھماکہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس سے نکلنے والی روشنی پوری کہکشاں میں چمک سکتی ہے۔ اس عمل میں وہ بھاری عناصر جیسے سونا، چاندی، اور لوہا پیدا ہوتے ہیں، جو پھر دیگر سیاروں اور اجرام میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ عناصر بعد میں زمین جیسی دنیا کے قیام میں مدد دیتے ہیں۔

وقت، مکان اور نظریہ اضافیت

کائنات کی ہیئتِ ترکیبی میں وقت اور مکان کی رمزیں ایک پیچیدہ مگر منظم ہم آہنگی میں پیوستہ ہیں۔ یہ محض جامد حقائق نہیں بلکہ تغیر پذیر کیفیات ہیں، جو کائناتی مظاہر کے زیرِ اثر بدلتی رہتی ہیں۔ اضافیت کا نظریہ اسی حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ وقت کی روانی اور مکان کی ساخت مطلق نہیں، بلکہ ثقلی میدان اور حرکی سرعت کے تابع ہے۔

زمان و مکان کی انعطاف پذیری

زمان و مکان ایک رواں دواں حقیقت ہیں، جو اجرامِ فلکی کی کمیت اور ان کی حرکی رفتار کے مطابق خم کھاتے ہیں۔

عظیم اجسام کے قرب میں وقت کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے، جیسے سیاہ شگاف کے کناروں پر وقت تقریباً ساکن ہو جاتا ہے۔ سرعتِ عظیم سے متحرک اجسام پر وقت سست گزرتا ہے، جبکہ سکون میں رہنے والوں کے لیے وہ معمول کے مطابق بہتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں انسان کی محدود فہم پر ضرب لگتی ہے، اور وہ اس معمے میں غرق ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا وقت ایک سراب ہے یا حقیقت؟

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

بے شک ایک دن تمہارے رب کے ہاں ہزار برس کے برابر ہے، جو تم شمار کرتے ہو۔ (سورۃ الحج: 47)

یہ اس حقیقت کی غمازی ہے کہ وقت کی پیمائش مطلق نہیں بلکہ حالات اور مقامات کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے۔

مطلقیت کا زوال اور حقیقتِ وقت

کائنات میں کوئی شے مطلق نہیں، ہر چیز ایک نسبتی ربط میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہی اضافیت کا خلاصہ ہے، جو ہمیں باور کراتا ہے کہ وقت، مکان اور مادہ محض ساکن تصورات نہیں بلکہ تغیر پذیر عوامل ہیں۔

یہ فلسفہ اُس ازلی حقیقت کی جھلک ہے جسے انسان ہمیشہ سے جاننے کا متمنی رہا ہے، مگر شاید حقیقت اپنی اصل میں کسی کی گرفت میں آنے کے لیے نہیں، بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے ہے۔

ایک فکری و سائنسی مکالمہ

کائنات کی وسعتوں میں وقت ایک مطلق حقیقت نہیں بلکہ اضافیت کا مظہر ہے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے یہ واضح کیا کہ وقت اور مکان ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ یہ ایک ہی وحدت کے دو پہلو ہیں، جنہیں ہم "زمان و مکان کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت وقت کی رفتار مشاہدہ کرنے والے کی حرکت اور کششِ ثقل کے اثرات کے تابع ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کریم میں مختلف پیرایوں میں بیان ہوئی ہے۔

مثال کے طور پر، سورۃ المعارج میں فرمایا گیا

(فرشتے اور روح (جبریل) اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔)

(سورۃ المعارج : ۴)

یہ آیت ایک غیر معمولی حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ مختلف مقامات پر وقت کی رفتار جداگانہ ہو سکتی ہے۔ یعنی جو وقت زمین پر ایک دن میں گزرتا ہے، کسی اور جہان میں وہی وقت ہزاروں یا لاکھوں سالوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ یہی اصول ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے تصور میں نظر آتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانوں پر اٹھایا، تو ان کے لیے زمینی وقت کا گزرنا کسی عام انسانی تجربے کی طرح نہیں تھا۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔) (سورۃ النساء : ۱۵۸)

یہ رفعِ عیسیٰ، محض ایک جسمانی بلندی نہیں بلکہ زمانی تغیر کی ایک اعلیٰ مثال بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے وقت ان کے لیے وقت ساکن ہوگا، جبکہ زمین پر صدیاں بیت چکی ہوں گی۔

سائنسی تشریح اور نظریہ اضافیت

آئن سٹائن کی جنرل تھیوری آف ریلیٹیویٹی کے مطابق اگر کوئی جسم کسی انتہائی طاقتور کششِ ثقل والے مقام، جیسے سیاہ شگاف کے قریب ہو تو اس کے لیے وقت بہت آہستہ گزرتا ہے، جبکہ بیرونی ناظرین کے لیے وہی وقت معمول کے مطابق تیز رفتاری سے جاری رہتا ہے۔

ہالی ووڈ کی مشہور فلم انٹرسٹیلر میں یہی اصول دکھایا گیا ہے، جہاں مرکزی کردار ایک ایسے سیارے پر جاتے ہیں جو ایک بڑے سیاہ شگاف کے قریب واقع ہوتا ہے۔ اس سیارے پر گزارا گیا ایک گھنٹہ زمین کے

سات سالوں کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی، جو شخص اس سیارے پر ایک مختصر وقت کے لیے بھی رہے گا، جب وہ زمین پر واپس آئے گا تو وہاں کئی دہائیاں گزر چکی ہوں گی۔

یہی تصور اگر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے تناظر میں دیکھیں تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ ان کے لیے وقت ساکن رہا ہو، اور جب وہ زمین پر واپس آئیں گے تو گویا وہ ابھی کچھ ہی دیر قبل آسمان پر گئے تھے، جبکہ زمین پر صدیاں بیت چکی ہوں گی۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر وقت کی لچکدار فطرت کی وضاحت کی گئی ہے۔ سورۃ الکھف میں اصحابِ کہف کے واقعے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(اور وہ اپنی غار میں تین سو سال رہے اور نو سال مزید بڑھ گئے۔) (سورۃ الکھف : ۲۵)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے وقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام انسانی تجربے سے مختلف تھا۔ اصحابِ کہف کے لیے وقت گویا ایک پل میں گزر گیا، مگر دنیا میں صدیاں بیت چکی تھیں۔ یہی اصول حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی لاگو ہو سکتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ بیان ہوا، جہاں ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے موت دے کر سو سال تک سلا دیا، پھر دوبارہ زندہ کر کے اس سے پوچھا

(اللہ نے پوچھا : تو کتنا ٹھہرا؟ اس نے کہا : ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔) (سورۃ البقرہ : ۲۵۹)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ کسی کے لیے وقت کا گزرنا اور حقیقت میں وقت کا گزرنا مختلف ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اور واپسی کو بھی اسی پیرائے میں سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ زمانی استثنا کے تحت وقت سے آزاد ہیں۔

ادبی اور فکری پہلو

یہ نظریہ صرف سائنسی نہیں بلکہ فکری اور روحانی لحاظ سے بھی انتہائی گہرائی رکھتا ہے۔ اگر وقت اور مکان ایک لچکدار حقیقت ہیں، تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانی ذہن کا ادراک ان کی مکمل حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی زمان اور لازمانی کے اس تصور کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے



تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

یہ شعر اس بات کا عکاس ہے کہ وقت ایک مسلسل حرکت میں رہنے والی شے ہے، لیکن اس کی ماہیت انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہے۔

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی زمانی استثنا کے تحت ہو، تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وقت صرف ایک دنیاوی مظہر ہے، جو خالقِ کائنات کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہے وقت کو روک سکتا ہے، جب چاہے آگے بڑھا سکتا ہے، اور جب چاہے کسی کو وقت کی قید سے آزاد کر سکتا ہے۔

نتیجہ

یہ نظریہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے وقت نہیں گزرا، نہ صرف قرآنی دلائل سے ہم آہنگ ہے بلکہ جدید سائنسی نظریات، جیسے اضافیت، سیاہ شگافوں کے گرد وقت کی سست رفتاری، اور زمانی استثنا کی

روشنی میں بھی ایک حقیقت پسندانہ تصور بنتا ہے۔ یہی کائنات کا سب سے بڑا راز ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سائنس، فلسفہ، تصوف اور مذہب یکجا ہو جاتے ہیں، ایک ایسے مقام پر جہاں انسانی عقل حیرت میں ڈوب جاتی ہے، اور صرف ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے

"اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

کائناتی اسرار اور فکری منازل

کائنات ایک بحرِ بے کراں ہے، جہاں مظاہرِ فطرت کی بوقلمونی انسان کو تفکر و تدبر کی دعوت دیتی ہے۔ انہی سربستہ رازوں میں سے ایک سیاہ شگاف اور نیوٹران ستارے ہیں، جنھیں جدید فلکیات کی پیچیدہ جستجو نے آشکار کیا، مگر قرآنِ حکیم میں ان اسرار کی جانب اشارات قرونِ اولیٰ میں ہی ملتے ہیں۔

معدومیت کی دبیز چادر میں لپٹا راز

جب کوئی عظیم الجثہ نجم اپنی طبعی زندگی کے اختتام پر عظیم انفجار سے دوچار ہوتا ہے، تو اس کا مرکز ایک ایسی کثیف اور مہیب قوت میں منقلب ہو جاتا ہے، جہاں کشش کی شدت اس نہج پر پہنچ جاتی ہے کہ خود روشنی کے ذرات بھی اس کی گرفت سے فرار نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں مادی قوانین اپنی بساط لپیٹ لیتے ہیں اور ایک ایسا عمیق خلا جنم لیتا ہے جو ہر شے کو اپنے اندر سمو لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں، چھپ جانے والے ہیں اور بہاؤ والے ہیں۔ سورہ التکویر، آیت 15-16

یہ آیات ان مخفی ستاروں کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو اپنی موجودگی کے باوجود پردۂ ظلمات میں چھپے رہتے ہیں، مگر ان کا اثر و نفوذ پورے نظامِ فلکی پر محیط ہوتا ہے۔

فلکیاتی جبر اور نور کی قید

اگر ستارے کی کمیت سیاہ شگاف میں ڈھلنے کے لیے ناکافی ہو، تو وہ ایک نہایت کثیف اور گھنے جرم میں تبدیل ہو جاتا ہے، جس کی ساخت نیوٹران ذرّات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا حجم محدود، مگر کثافت اس قدر شدید ہوتی ہے کہ ایک چٹکی بھر مادہ بھی کئی پہاڑوں کے وزن کے برابر ہو سکتا ہے۔

یہ ستارہ اپنے محور پر اس سرعت سے گردش کرتا ہے کہ ہر لحہ خلا میں توانائی کی لہریں خارج کر رہا ہوتا ہے۔

یہ مظہر انسان کے لیے عبرت کا مقام ہے کہ کس طرح اللہ رب العزت نے قوت و عظمت کے ایسے پہلو تخلیق کیے جو مخلوق کو اپنی بے ثباتی اور فنا پذیری کا احساس دلاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور بے شک ہم ہی اسے وسعت دینے والے ہیں۔ "(سورۃ الذاریات : 47)

یہ آیت اس حقیقت کی غماز ہے کہ کائنات اپنی تخلیق کے بعد مسلسل ارتقا پذیر ہے اور اس میں ہونے والے تغیرات کسی اتفاقیہ عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ خالقِ کائنات کی تدبیر و حکمت کا ایک جزء ہیں۔

حقیقتِ منتہی، فکر و تدبر کی دعوت

سیاہ شگاف اور نیوٹران ستارے وہ آفاقی حقائق ہیں جو انسان کو اس کے علم کی حدود اور فہم کی وسعتوں پر غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جہاں سیاہ شگاف تمام روشنیوں کو نگل کر معدومیت کے راز میں چھپ جاتا ہے، وہیں نیوٹران ستارہ اپنی بقیہ زندگی میں اپنے گردونواح کو اپنی روشنی سے منور رکھتا ہے۔ یہ دونوں مظاہر ایک گہرے فکری استدلال کو جنم دیتے ہیں، ایک طرف فنا، نیستی اور زوال کا درس، تو دوسری طرف روشنی، بقاء اور دوام کی علامت۔ یہ اسرارِ کائنات محض سائنسی مباحث نہیں بلکہ حقیقتِ مطلق کی جانب انسانی ذہن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم، حکمت اور وجدان یکجا ہو جاتے ہیں، اور انسان اپنے ہونے کے مفہوم پر از سرِ نو غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

سپیس ٹائم، واقعہ معراج اور جدید سائنس، ایک فکری تجزیہ

کائنات کی حقیقت ہمیشہ سے انسانی فکر کے افق پر ایک معمہ رہی ہے۔ مابعد الطبیعات اور جدید سائنس، دونوں نے اپنی اپنی جہت میں اس راز کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم واقعۂ معراج اور سپیس ٹائم کی جدید سائنسی تعبیر کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو ایک حیران کن فکری جہان آشکار ہوتا ہے، جہاں روحانی اسرار اور سائنسی نظریات ایک دوسرے میں گم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

واقعہ معراج اور سائنسی امکان

اسلامی عقیدے کے مطابق، واقعۂ معراج میں نبی اکرم ﷺ کو انتہائی مختصر وقت میں آسمانوں کی سیر کروائی گئی اور وہ عالم ملکوت میں ایسے سفر پر روانہ ہوئے، جہاں وقت اور مکان کے عام قوانین معطل نظر آتے ہیں۔

اگر ہم معراج کے سفر کو نظریۂ اضافیت کی روشنی میں دیکھیں تو ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سفر روشنی کی رفتار یا اس سے بھی زیادہ کسی مافوق الفطرت قوت کے ذریعے ممکن ہوا ہو۔ سائنسی اعتبار سے روشنی کی رفتار پر وقت کا رک جانا ایک معلوم حقیقت ہے، اور اگر معراج میں وقت کی رفتار انسانی فہم سے مختلف تھی، تو واپسی پر نبی اکرم ﷺ کا وقت زمین پر موجود لوگوں کے وقت سے مختلف ہو سکتا تھا۔

یہاں ایک اور حیران کن حقیقت بلیک ہولز اور ورم ہولز کی نظریاتی موجودگی ہے، جنہیں جدید طبیعیات میں قلیل المدت زمانی سرنگیں کہا جاتا ہے۔ سائنسدان مانتے ہیں کہ اگر کوئی ہستی کسی ورم ہول سے گزرے تو وہ مختلف جہات میں بیک وقت موجود ہو سکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ معراج بھی کسی ایسے ہی کائناتی راستے سے ہو؟

یہ امر نہایت فکر انگیز اور عمیق غور و خوض کا متقاضی ہے کہ بلیک ہولز اور ورم ہولز جیسے سائنسی مظاہر کو معراج جیسے روحانی و فوق الفطرت واقعے کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ جدید طبیعیات کی رو سے یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ کائنات میں بعض مقامات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جہاں مکان و زمان اپنی روایتی ساخت سے ماوراء ہو کر کسی ایسے پل یا راستے کو جنم دے سکیں جو بعید المسافت مقامات کو یکلخت مربوط کر دے۔

ورم ہولز یا وہ نظریاتی زمانی و مکانی درزیں ہیں جو کائنات کے دو مختلف حصوں کو آپس میں مربوط کر سکتی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک کوئی عملی شہادت دستیاب نہیں، لیکن ریاضیاتی ماڈلز کے مطابق، ایک ایسی سرنگ کا امکان موجود ہے جو مختلف جہات، متوازی کائناتوں یا بعید المقامات مقامات کو فوری طور پر آپس میں جوڑ سکتی ہے۔

اس ضمن میں، قرآن حکیم میں وارد بعض آیات، بالخصوص سورہ المومنون کی سترہویں اور اٹھارہویں آیات، نہایت غور و فکر کی متقاضی ہیں۔

اور بے شک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائیے اور ہم تخلیق سے بے خبر نہیں۔ اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے مطابق پانی نازل کیا، پھر ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا، اور ہم اس کے ختم کر دینے پر بھی قادر ہیں۔ سورہ المومنون : 17-18

یہاں لفظ سات راستے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ عربی زبان میں طرق کا مفہوم صرف طبقات یا منازل پر محیط نہیں، بلکہ یہ ایسے مجازی اور مادی راستوں کو بھی شامل کرتا ہے جو کسی بھی دو مقامات کو مربوط کر سکتے ہیں۔ اگر اس آیت کو جدید طبیعیات کی روشنی میں پرکھا جائے، تو یہ بعید نہیں کہ یہ کائناتی راستوں، اضافی جہات یا ورم ہولز جیسے نظریات کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں معراج النبی ﷺ کا واقعہ ہمارے فہم سے ماوراء حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کائنات میں ایسے مخفی راستے یا سرنگیں موجود ہیں، تو یہ بعید نہیں کہ معراج بھی کسی ایسے ہی غیر مرئی زمانی و مکانی راستے سے وقوع پذیر ہوا ہو، جہاں طبیعی قوانین معطل ہو جاتے ہیں اور زمانی تسلسل منجمد ہو جاتا ہے۔

آیت میں آگے فرمایا گیا کہ ، اور ہم تخلیق سے بے خبر نہیں

یہاں یہ واضح کیا جارہا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی رونما ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے کامل علم اور قدرت کے تحت ہے۔ اگر ورم ہولز، اضافی جہات یا کسی بھی دوسرے کائناتی راستے کا وجود ممکن ہے، تو یہ بھی اللہ کے تخلیقی نظام کا ہی ایک جز ہوگا۔

اسی آیت کے اگلے حصے میں آسمان سے پانی کے نزول اور اس کے زمین میں ٹھہرائے جانے کا ذکر ہے۔ عام فہم میں یہ بارش کے نظام کی طرف اشارہ ہے، لیکن بعض سائنسی نظریات یہ تجویز کرتے ہیں کہ زمین پر موجود پانی ممکنہ طور پر کسی کائناتی ماخذ سے آیا ہو، یعنی دُور افتادہ سیاروں، دم دار ستاروں یا بین النجم بادلوں سے۔ اگر ایسا ہے، تو یہ بات ہمارے اس قیاس کو مزید تقویت دیتی ہے کہ قرآن ان کائناتی حقائق کی جانب اشارہ کر رہا ہے جن کی تفہیم سائنس اب جا کر کر رہی ہے۔

یہاں ایک نہایت اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا معراج جیسے واقعات کو محض سائنسی اصولوں کے تابع رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے؟ اگرچہ طبیعیات میں ایسے امکانات کی گنجائش موجود ہے، لیکن معراج کو کسی ایک طبیعیاتی اصول تک محدود کر دینا اس کے ماورائی اور روحانی پہلو سے صرفِ نظر کرنا ہوگا۔ سائنسی نظریات کا دائرہ محدود ہے، جبکہ معراج ایک ایسا واقعہ ہے جو مادی و روحانی حقیقتوں کا امتزاج تھا۔

اگر مستقبل میں سائنس ایسے قوانین دریافت کر لے جو ورم ہولز یا اضافی جہات کی حقیقت کو ثابت کر دیں، تو یہ ممکن ہے کہ ہم قرآن کے ان اشارات کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ تاہم، اس وقت تک یہ کہنا ہی مناسب ہوگا کہ قرآن ایک وسیع تر پیغام کا حامل ہے، اور سائنسی نظریات کی محدود تفہیم اس کے مضامین کو مکمل طور پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ کائنات کی حقیقت، زمانی و مکانی سرنگوں کا وجود، اور معراج

جیسے مظاہر، یہ سب وہ سربستہ راز ہیں جنھیں انسانی عقل مکمل طور پر سمو نہیں سکتی۔ البتہ غور و فکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے، اور علم کی جستجو ہمیں ان حقائق کے قریب تر لے جانے میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔

نتیجہ، سائنس، فلسفہ اور ایمان کا امتزاج

سپیس ٹائم، ورم ہولز، معراج اور جدید سائنس کا یہ فکری تجزیہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ انسانی علم ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ وہ حقیقت، جسے قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کیا، آج سائنسی نظریات اس کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بحث اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ سائنس اور روحانیت کو ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے تکمیل کنندہ کے طور پر دیکھا جائے۔ انسان کا شعور جیسے جیسے وسعت اختیار کرے گا، ویسے ویسے وہ کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں مزید اسرار سے پردہ اٹھائے گا۔ معراج کا سفر محض ایک واقعہ نہیں، بلکہ ایک ایسا دروازہ ہے، جو فکر انسانی کو نئی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

جیمز ویب خلائی دوربین کے حیرت انگیز انکشافات

انسانی فکر جب آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگی اور فلکیاتی اسرار و رموز کو جاننے کی جستجو شدید تر ہوئی تو سائنسی ترقی نے ایک ایسا شاہکار تخلیق کیا جو کائنات کے سب سے دور افتادہ گوشوں کو بھی عیاں کرنے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی کارنامہ جیمز ویب اسپیس ٹیلی اسکوپ کے ذریعے انجام پایا، جو جدید ترین سائنسی ٹیکنالوجی کی معراج اور فلکیاتی تحقیق کا ایک بے مثال سنگِ میل ہے۔

جیمز ویب اسپیس ٹیلی اسکوپ کا آغاز 1996ء میں ہوا، جب ناسا یورپی خلائی ایجنسی اور کینیڈین خلائی ایجنسی نے مل کر ایک جدید خلائی دوربین کے منصوبے پر کام شروع کیا۔ یہ ٹیلی اسکوپ ہبل اسپیس ٹیلی اسکوپ کی جانشین قرار دی گئی، جو کئی دہائیوں تک فلکیاتی تحقیق میں بنیادی کردار ادا کر چکی تھی۔ تاہم، ہبل کی محدودات اور بڑھتے ہوئے سائنسی تقاضوں نے ایک زیادہ جدید اور حساس مشاہداتی آلے کی ضرورت کو اجاگر کیا، جو مزید دور دراز کہکشاؤں، ابتدائی کائنات کے نشانات، اور پیچیدہ فلکیاتی مظاہر کا مطالعہ کر سکے۔

کئی دہائیوں کی تحقیق، انجینئرنگ کے پیچیدہ مراحل، اور غیر معمولی سائنسی اختراعات کے بعد 25 دسمبر 2021ء کو جیمز ویب ٹیلی اسکوپ کو آریان-5 راکٹ کے ذریعے خلا میں روانہ کیا گیا۔ یہ دوربین لاریجریان پوائنٹ 2 پر تعینات کی گئی، جو زمین سے تقریباً 15 لاکھ کلومیٹر دور واقع ہے اور جہاں سورج، زمین اور چاند کی کشش ثقل کا توازن اسے مستحکم رکھتا ہے۔

فلکیات کی دنیا میں جیمز ویب خلائی دوربین ایک ایسا سنگ میل ہے جس نے کائنات کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ یہ حیرت انگیز مشین خلائے بسیط کے دور دراز گوشوں تک جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جہاں تک انسانی آنکھ یا پرانی سائنسی دوربینیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہ فلکیاتی تحقیق کی ایک انقلابی پیش رفت ہے جو ابتدائی کہکشاؤں، بین النجم مادہ، ستاروں کی پیدائش اور ماورائے ارض سیاروں کی حقیقتوں کو آشکار کر رہی ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں نظر دوڑائیں تو ہر سو حیرت انگیز نظام اور قوانین کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کہکشاں، ہر ستارہ، ہر سیارہ ایک خاص ترتیب اور

غیر متزلزل ضابطے کے تابع گردش کر رہا ہے۔ کیا یہ سب محض ایک اتفاق ہے یا اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت پوشیدہ ہے۔

جیمز ویب خلائی دوربین نے ابتدائی کہکشاؤں کی روشنی کو دیکھ کر اس حقیقت کی تصدیق کی کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور اس کی تخلیق ایک زبردست دھماکے سے ہوئی تھی۔ روشنی جو اربوں نوری سال کا سفر طے کر چکی ہے اب ہمارے مشاہدے میں ہے اور اس نے ازلی کائناتی مظاہر کے اسرار کو منکشف کیا ہے۔

یہ حیران کن خلائی مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ کہکشائیں نہ صرف پیدا ہو رہی ہیں بلکہ ان کا ارتقا بھی مسلسل جاری ہے۔ اس دوربین نے کئی سیاہ شگافوں کا سراغ لگایا جو کہکشاؤں کے مرکز میں موجود ہیں اور ناقابل تصور کشش ثقل رکھتے ہیں۔ ان کے گرد موجود شدید ثقلی دباؤ مادے کو ایک نقطے میں سمو دیتا ہے جہاں تمام طبیعیاتی قوانین بے معنی ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وہی ہے. جس نے بغیر کسی ستون کے آسمانوں کو بلند کیا تم انہیں دیکھ نہیں سکتے پھر وہ عرش پر جلوہ گر ہوا اور سورج و چاند کو مسخر کر دیا ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلتا رہے گا وہی امور کی تدبیر کرتا ہے تاکہ تم یقین کر سکو

سورہ رعد آیت 2

اس خلائی مشاہدے کا ایک اور حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ماورائے ارض سیاروں کے فضائی تجزیے میں کئی ایسے کیمیائی عناصر دریافت کیے گئے ہیں جو زندگی کی موجودگی کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ پانی، میتھین، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر نامیاتی مرکبات ان سیاروں پر موجود ہیں جو ہماری زمین کی طرح کسی نہ کسی حد تک زندگی کے لیے سازگار ہو سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور وہی ہے جس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ تمھیں لے کر جھک نہ جائے اور دریا بنائے اور راستے تاکہ تم راہ پا سکو اور نشانیاں بھی رکھیں اور لوگ ستاروں سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں
سورہ نحل آیات 15-16

کہکشاؤں کی انتہائی قدیم ترین تصاویر، کائناتی ازل کی جھلک

جمیز ویب اسپیس ٹیلی سکوپ نے فلکِ بسیط کے نہاں خانوں میں جھانکتے ہوئے وہ مناظر قید کیے ہیں، جو ازلِ کائنات کے اولین لمس کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ کہکشائیں نمودار ہوئی ہیں، جن کا وجود ابتدائی عہدِ آفرینش میں منصۂ شہود پر آیا تھا، جب فلکیاتی اجسام ابھی اپنے اولین خدوخال تراش رہے تھے اور وقت کی رگوں میں روشنی کے پہلے سوتے بہہ رہے تھے۔

یہ کہکشائیں، جو ہبل کی نگاہوں سے اوجھل تھیں، جمیز ویب کے فروغِ تابانی نے آشکار کیں، اور یہ انمول شہادتیں فراہم کیں کہ کائنات کی ابتدا کس طرح کے مظاہر سے آراستہ تھی۔ مادے کے اولین ارتکاز،

کششِ ثقل کے دستِ جادوگری سے کہکشاؤں کی ترتیب، اوران کے اولین ستاروں کی تجلیات وہ رازہیں جواب انسانی شعور کے مدارج میں ایک نئیے باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ تصاویر، جو وقت کی سنگین دیواروں کو توڑتی ہوئی ہمیں تیرہ ارب سال پیچھے لے جاتی ہیں، ایک ایسے عہد کا پتہ دیتی ہیں جب کائنات کی تشکیل ابتدائی مراحل میں تھی۔ ان میں کہکشائیں محض روشنی کے جھرمٹ نہیں بلکہ فلکیاتی تاریخ کے وہ زندہ آثار ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح بگ بینگ کے بعد گیس وغبار کے بے ہنگم بادل کششِ ثقل کی آغوش میں سمٹ کر اولین کہکشاؤں کی صورت میں متشکل ہوئے۔

یہ مناظر سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب سے کم نہیں، کہ جو کہکشائیں محض نظری مباحث اور مفروضوں کا حصہ تھیں، اب وہ اپنے جلوے بکھیر رہی ہیں اور ہمیں کائیناتی ابتداء کے اسرار میں جھانکنے کا موقع دے رہی ہیں۔ یہ تصاویر محض روشنی کے نقوش نہیں بلکہ وہ کہانیاں ہیں جو کائنات کی پیدائش، اس کی ابتدائی پرورش، اوراس کے ارتقائی مراحل کے پوشیدہ پرت وا کرتی ہیں۔

ابتدائی کائینات میں کہکشاؤں کی غیر متوقع پیچیدگیاں

جمیز ویب اسپیس ٹیلی سکوپ کے حیرت انگیز انکشافات میں سے ایک ابتدائی کائینات میں کہکشاؤں کی غیر متوقع پیچیدگی ہے، جو ہمارے موجودہ فلکیاتی نظریات کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آئی ہے۔ کائیناتی ارتقا کے اس ابتدائی دور کو عام طور پر ایک ایسے مرحلے کے طور پر تصور کیا جاتا تھا جہاں کہکشائیں نوزائیدہ، بے ترتیب اور نامکمل ہوتی ہیں، مگر جمیز ویب کے فراہم کردہ بصری شواہد نے اس مفروضے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے

(اور آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم اسے برابر وسعت دے رہے ہیں)

(سورۃ الذاریات : 47)

یہ آیتِ مبارکہ کائنات کے مسلسل پھیلنے کی سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس کی تصدیق جدید فلکیاتی تحقیقات نے کی ہے۔ جمیز ویب کے انکشافات میں کہکشاؤں کی پیچیدہ ساخت اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ نے نہ صرف کائنات کو تخلیق کیا بلکہ اسے ایک خاص نظم و ترتیب سے وسعت بخشی۔

ان مشاہدات سے یہ ثابت ہوا کہ فلکیاتی تاریخ کے ابتدائی ابواب میں کہکشائیں نہ صرف اپنے بنیادی ڈھانچے میں ترتیب پذیر ہو چکی تھیں بلکہ حیران کن طور پر پیچیدہ، منظم اور ترقی یافتہ بھی تھیں۔ یہ کہکشائیں محض ابتدائی گرد و غبار اور گیس کے بے ہنگم بادل نہیں، بلکہ ایسے فلکیاتی اجسام تھیں جنھوں نے اپنی ہیئت، گردش اور توانائی کے توازن کو غیر متوقع حد تک مستحکم کر لیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

"الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ"

(جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر جلوہ گر ہوا)

(سورۃ الفرقان : 59)

یہ آیت تخلیقِ کائنات کی تدریجی فطرت اور اس کی عظیم تنظیم پر دلالت کرتی ہے۔ جمیز ویب کی فراہم کردہ تصاویر اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ اللہ کی تخلیق ابتدا سے ہی خاص نظم اور ترتیب کے تحت تھی۔

یہ پیچیدگیاں محققین کے لیے کئی سوالات کو جنم دیتی ہیں: کیا کہکشائیں ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تیزی سے ارتقا پذیر ہوئیں؟ یا پھر ابتدائی کائنات کے طبیعیاتی قوانین میں کچھ ایسے غیر دریافت شدہ عناصر شامل ہیں جو ہمارے موجودہ سائنسی ماڈلز میں موجود نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا

(اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا، سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں)

(سورۃ الانبیاء: 33)

یہ آیت اس کائناتی نظم و ترتیب کو بیان کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کی عکاس ہے۔ جمیز ویب ٹیلی سکوپ کے مشاہدات میں کہکشاؤں کی پیچیدہ حرکات اسی الٰہی ترتیب کی تصدیق ہیں، جو کائنات کی ہر شے کو ایک خاص میزان میں پروئے ہوئے ہے۔

یہ دریافت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہمیں اپنے فلکیاتی نظریات میں نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور شاید ہمیں کہکشانی ارتقا کے بارے میں بالکل نئے اصول دریافت کرنے ہوں گے جو ان غیر متوقع پیچیدگیوں کی تشریح کر سکیں۔

(یہ ہے اللہ کی تخلیق، پس مجھے دکھاؤ کہ اس کے سوا تمہارے معبودوں نے کیا پیدا کیا ہے؟)

(سورۃ لقمان : 11)

یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ کائنات کے اسرار اور پیچیدگیاں محض سائنسی دریافتیں نہیں، بلکہ خالقِ کائنات کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ ہر نئی دریافت انسان کو اللہ کی عظمت اور اس کی تخلیق کے اسرار میں مزید غوطہ زن کرتی ہے۔

بلیک ہولز کے گرد موجود مادہ، ایک فلکیاتی معما

کائنات کے سب سے پراسرار مظاہر میں سے ایک بلیک ہول کا وجود، اس کے گرد موجود گرد و غبار، پلازما اور شدید کشش کی لپیٹ میں آئے ہوئے اجسام کا پیچیدہ نظام انسانی فہم کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی حیرت کا سامان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں طبیعیات کے روایتی اصول اپنی حد کو پہنچ کر حیران کن امکانات میں ڈھل جاتے ہیں۔ جمیز ویب اسپیس ٹیلی سکوپ نے بلیک ہولز کے گرد موجود مادے کی غیر معمولی تفصیلات فراہم کی ہیں، جنھوں نے فلکیات دانوں کو ایک نئی دنیا کے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے

پس میں قسم کھاتا ہوں ان تاریک ہو جانے والے، پس پردہ چلے جانے والے سیاروں کی

(سورۃ التکویر : 15-16)

یہ آیت مبارکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کائنات میں کچھ ایسے اجسام بھی ہیں جو نہ صرف اپنی موجودگی کو چھپائے رکھتے ہیں بلکہ اپنی شدید کشش کی بدولت روشنی کو بھی قید کر لیتے ہیں، جس کا سائنسی ثبوت بلیک ہولز کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

بلیک ہول کے گرد موجود مادہ، کشش، درجہ حرارت اور روشنی کا رقص

بلیک ہول کے گرد جو مادہ، گیس اور توانائی مجتمع ہوتی ہے، اسے ایکریشن ڈِسک کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مہیب کشش ثقل تمام اجسام کو اپنی گرفت میں لے کر دیوانہ وار گردش پر مجبور کر دیتی ہے، جس کے نتیجے میں بے پناہ درجہ حرارت پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

(قسم ہے اس آسمان کی جو پلٹانے والا ہے)

(سورۃ الطارق : 11)

یہ آیت ایک ایسے کائناتی اصول کی جانب اشارہ کرتی ہے جہاں ہر شے کسی نہ کسی صورت میں پلٹ کر اپنے منبع کی جانب لوٹتی ہے۔ بلیک ہولز کے گرد موجود مادہ بھی ایک خاص کشش کے تحت گھومتا، بلند درجہ حرارت پر چمکتا اور بالآخر بلیک ہول میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔

جمیز ویب ٹیلی سکوپ نے اس ایکریشن ڈِسک کے اندرونی اور بیرونی حصوں کو حیرت انگیز تفصیلات کے ساتھ واضح کیا ہے، جہاں درجہ حرارت کئی ملین ڈگری سیلسیئس تک جا پہنچتا ہے۔ یہ مادہ مختلف طولِ موج پر

شدید الیکٹرو میگنیٹک ریڈی ایشن خارج کرتا ہے، جو ہمیں دور دراز کہکشاؤں کے مرکز میں روشن دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

روشنی کا قیدی مادہ، فوٹون اسفیئر اور ریڈی ایشن ببلز

بلیک ہول کے گرد ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں روشنی کی کرنیں بھی قید ہو کر رہ جاتی ہیں، اسے فوٹون اسفیئر کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا حلقہ ہے جہاں سے گزرنے والی روشنی نہ تو فرار ہو سکتی ہے اور نہ ہی سیدھے راستے پر برقرار رہ سکتی ہے، بلکہ بار بار جھک کر ایک دائرے میں محوِ گردش رہتی ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(اور ہم نے رات کو پردہ بنا دیا)

(سورۃ النبأ: 10)

یہ حقیقت بلیک ہولز کی تاریکی اور اس کے گرد روشنی کے چھپ جانے کے سائنسی نظریے کے عین مطابق ہے۔

ریلاٹیویٹی اور مادے کی حدیں

آئین سٹائین کے نظریۂ اضافیت کے مطابق، جب کوئی شے بلیک ہول کے قریب پہنچتی ہے تو وقت کی رفتار بدلنے لگتی ہے۔ جو مادہ بلیک ہول کی ایونٹ ہورائزن کے قریب ہوتا ہے، وہ ایک ایسے سفر پر نکل جاتا ہے. جس کا اختتام ہمیں ایک بے کراں تاریکی میں نظر آتا ہے۔

یہاں قرآن کی ایک اور آیت مبارکہ روشنی ڈالتی ہے

"اللّٰہُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ"

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ ہو)

(سورۃ النور: 35)

یہ آیت اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ روشنی اور توانائی کی اصل حقیقت صرف اللہ کے علم میں ہے، جبکہ انسان ابھی تک اس کے مظاہر کو دریافت کرنے میں سرگرداں ہے۔

نتیجہ، ایک کائناتی راز کا پردہ چاک ہوتا ہوا

جمیز ویب ٹیلی سکوپ نے بلیک ہولز کے گرد موجود مادے کے بارے میں جو تفصیلات فراہم کی ہیں، وہ ہماری فلکیاتی تفہیم کو نہ صرف وسعت دیتی ہیں بلکہ ان ماورائی قوانین کی نشاندہی کرتی ہیں جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔

یہ دریافتیں نہ صرف کائینات کی تخلیق کے بارے میں ہمارے نظریات کو مزید گہرا کرتی ہیں بلکہ اس ابدی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ یہ سب کسی اتفاقیہ حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ خالقِ کائینات کی حکمت و قدرت کا مظہر ہے۔

(وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے، خوف اور امید کے ساتھ، اور وہی بھاری بادلوں کو اٹھاتا ہے)

(سورۃ الرعد : 12)

یہ آیت بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کائینات کے اندر تمام مظاہر کسی خاص الٰہی تدبیر کے تحت جاری و ساری ہیں۔ بلیک ہولز کے گرد موجود مادہ، اس کا شدید درجہ حرارت، اس کی عجیب و غریب حرکات اور اس کے اثرات ہماری محدود سائینسی فہم کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی اندھی طاقت کے بس کی بات نہیں بلکہ ایک عظیم خالق کی صناعی کا کرشمہ ہے۔

بگ بینگ اور قرآن الحکیم : ایک سائینسی و قرآنی مطالعہ

کائینات کے آغاز اور اس کی وسعت کے متعلق انسانی جستجو ازل سے جاری ہے۔ جدید سائنس میں بگ بینگ تھیوری کو کائینات کی تخلیق کی سب سے مستند وضاحت سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ بیان کرتا ہے کہ آج سے تقریباً 13.8 ارب سال قبل کائینات ایک انتہائی کثیف اور گرم نقطے سے وجود میں آئی اور تب سے مسلسل پھیل رہی ہے۔ حیرت انگیز طور پر، قرآن مجید جو کہ چودہ سو سال قبل نازل ہوا، اس میں ایسے کئی اشارات ملتے ہیں جو اس سائینسی نظریے سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔

بگ بینگ کا سائنسی جائزہ

بگ بینگ کے مطابق، تمام مادی اجزاء، توانائی، وقت اور خود مکان ایک بے حد چھوٹے، کثیف اور گرم نقطے میں مجتمع تھے۔ ایک عظیم دھماکے کے بعد، یہ ساری توانائی اور مادہ ایک زبردست رفتار سے پھیلنے لگا، جس کے نتیجے میں ابتدائی ذرات، نیوکلیائی ردِ عمل، اور پھر کہکشائیں، ستارے اور سیارے تشکیل پانے لگے۔ یہ نظریہ ہبل کے قانون، کاسمک مائیکروویو بیک گراؤنڈ ریڈی ایشن اور کیمیائی عناصر کی ابتدائی ترکیب جیسے شواہد پر مبنی ہے۔

قرآن میں بگ بینگ کے اشارات

"أَوَلَمْ يَرَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ أَنَّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ"

(سورۃ الأنبياء، آیت 30)

کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین آپس میں جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا، اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا، تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

یہ آیت بگ بینگ تھیوری کے بنیادی تصور سے غیر معمولی مماثلت رکھتی ہے۔ سائنسی نظریہ بھی یہی کہتا ہے کہ ابتدا میں تمام مادہ اور توانائی ایک نقطے میں مرتکز تھی، اور پھر ایک عظیم دھماکے کے نتیجے میں یہ سب جدا ہوا۔ قرآن میں استعمال ہونے والا لفظ رتق کا مطلب ہے جڑا ہوا یا ایک اکائی، اور فتق کا مطلب ہے کھول دینا یا الگ کرنا۔ یہ بالکل بگ بینگ کی وضاحت معلوم ہوتی ہے۔ بگ بینگ تھیوری کے مطابق کائنات اب بھی مسلسل پھیل رہی ہے، جس کی تصدیق 1929ء میں ایڈون ہبل نے کی تھی۔

بگ بینگ کے بعد ابتدائی کائینات میں روشنی نہیں تھی، کیونکہ ایٹمز ابھی مکمل طور پر وجود میں نہیں آئے تھے۔ ابتدائی کائینات ایک کثیف، دھندلی اور تاریک گیس کے بادل سے بھری ہوئی تھی، جو بعد میں ٹھنڈی ہو کر کہکشانی ساخت میں ڈھلنے لگی۔

قرآن اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا، پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ خوشی یا ناخوشی سے چلے آوَ، دونوں نے کہا، ہم بخوشی حاضر ہیں۔ (سورۃ فصّلت، آیت 11)

یہ دُخان (دھواں) کا ذکر ابتدائی کائینات کی اس دھندلی اور گیس بھری حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے جدید سائنس کہتی ہے، جو ستاروں اور کہکشاؤں کے بننے سے پہلے موجود تھی۔

بگ بینگ تھیوری آج سائنسی دنیا میں ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، مگر قرآن نے چودہ سو سال پہلے ہی کائینات کے آغاز، اس کے پھیلاوَ، اور اس کی ابتدائی حالت کا ذکر کر دیا تھا۔

کائناتی تفکر اور انسان کی ذمے داری

یہ تمام دریافتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کائنات میں کوئی چیز بھی بے مقصد نہیں۔ ہر ستارہ، ہر کہکشاں، ہر سیارہ ایک منظم حکمت کے تحت گردش کر رہا ہے اور انسان کو ان مشاہدات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگرچہ سائنسی ترقی نے ان رازوں کو کچھ حد تک بے نقاب کر دیا ہے مگر اصل سوال یہی ہے کہ کیا انسان ان نشانیوں سے کوئی بصیرت حاصل کرے گا یا نہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اسے کہتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے ، سورہ انعام ، 73

یہ حیرت انگیز مشاہدات ہمیں نہ صرف کائنات کی وسعتوں کا علم دیتے ہیں بلکہ اس کائناتی نظام کے پس پردہ کارفرما عظیم حکمت کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ کیا انسان محض ان سائنسی حقائق پر غور کرے گا یا ان سے آگے بڑھ کر اس خالق کے وجود کو بھی پہچانے گا جو ان سب کو تخلیق کرنے والا ہے۔

نظم، تغیرِ ابدی و ثباتِ لامکاں

کہاں ہے ازل، کونسا ہے ابد؟
یہ سب وہمِ ہستی، یہ موہوم حد!
یہ لمحے، یہ صدیاں، یہ گردش، یہ پل
فقط اک تماشا، فقط اک خلل

یہ ساعت، یہ صدیاں، یہ دورِ رواں
یہ سب ہے مجازی، حقیقت کہاں؟
مکاں ایک سایہ، زماں ایک خواب
نہ کوئی سراغ اور نہ کوئی حساب

کہیں وقت ٹھہرا، کہیں دوڑتا
کہیں منجمد ہے، کہیں چھوڑتا
وہ لمحہ جو گزرا، تھا موجود کب؟
یہ سب فانی صورت، یہ سب ہے عجب

یہ گردابِ ہستی، یہ گردش کا راز
کہیں راہِ کہنہ، کہیں نو آغاز
وہی عیسیٰ وقت، وہی رفع نور
نہ لمحہ یہ گزرے، نہ بدلے ظہور

یہی وقت ہے، جو ہے بے انتہا
نہ آغاز اس کا، نہ کوئی فنا
یہ جتنا بھی بہتا ہے دریا کا سا
ہے ساکن مگر وہی قطرہ وراہ

ذرا سوچو سالک، کہ تُو ہے کہاں؟
تری زیست کیا ہے؟ ترا کارواں؟
یہ سب ہے سرابِ خیال و شعور
یہ سب ہے حقیقت محض ایک دور!

نبی اکرم ﷺ، امام المرسلین اور خاتم النبیین کی شان میں عظمت و کمال

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ،

اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ

نبی اکرم ﷺ کی شان کا بیان نہ صرف لفظوں کی طاقت کا متقاضی ہے، بلکہ یہ انسان کی عاجزی اور عقل کی محدودیت کی حدود کو بھی چھوتا ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں خدا کی حکمت اور رحم کا ایسا جلوہ نظر آتا ہے کہ وہ تمام کائنات کی تمام تر جلیل القدر ہستیوں سے بلند و بالا ہیں۔ آپ ﷺ کی شخصیت میں ایسے مراتب کی پرواز ہے کہ ان تک رسائی انسان کے ادراک کی دسترس سے باہر ہے، اور یہ وہ عظمت ہے جس پر صرف سکوت اور تعظیم کا جواب ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ کی حیثیت انبیاء کے امام اور سردار ہونے کی ہے؛ آپ وہ ہستی ہیں جن کی عظمت کا آغاز ہی نہ تھا اور نہ ہی اس کا اختتام ممکن ہے۔ تمام انبیاء اور مرسلین کی رہنمائی کا مقصد ایک ہی نقطے پر مرکوز تھا، اور وہ نقطہ تھا محمد ﷺ۔ آپ ﷺ کی نبوت کا تاج تمام آسمانی ہدایتوں کا سنگِ میل ہے، آپ ﷺ کی آمد نے دنیا کی تقدیر کو ایک نئی سمت عطا کی، جہاں ہر ذرہ اور ہر گوشہ آپ کی رہنمائی کا منتظر تھا۔

آپ ﷺ کے کمالات کا بیان کرنے والی زبانیں تھک جاتی ہیں، دلوں کی تو بات ہی اور ہے کہ وہ آپ ﷺ کی شان میں کمالِ محبت اور عقیدت کے نغمے گاتے نہیں تھکتے۔ آپ ﷺ کا نور نہ صرف یہ کہ پوری کائنات میں پھیل چکا ہے، بلکہ آپ کے نور کا دروازہ اس عالمِ کبریائی تک پہنچتا ہے جس تک نہ تو عقل کا پہنچنا ممکن ہے اور نہ ہی کسی کی زبان کو اس کی حقیقت کا پورا ادراک ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں؛ آپ وہ نبی ہیں جن کی نبوت کا سلسلہ قیامت تک کے لیے بند ہو گیا۔ آپ کی آمد تمام انبیاء کے بعد سب سے آخری پیغام لے کر آئی، اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے تمام فکری، روحانی، اور معاشرتی خلا کو پر کر دیا۔ آپ کی نبوت کا پیغام ہر زمانہ و مکان کے انسانوں کے لیے ہے، یہ آپ کی عالمگیر اور آفاقی حیثیت کی دلیل ہے۔ آپ کے بعد کسی نبی کی آمد نہ ہوئی اور نہ ہی ممکن ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت تمام تر انسانی حاجات کا مکمل جواب ہے۔

تمام انبیاء کے امام ہونے کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ آپ ﷺ کی رہنمائی میں مکمل آسمانی پیغامات کا ظہور ہوا، بلکہ اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے افعال، اقوال اور ہر عمل میں اللہ کی حکمت اور شریعت کا ہر پہلو شامل ہے، جو انسان کی روحانی ترقی کے تمام مراحل کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا مقام جتنا بلند ہے، اتنی ہی گہرائی میں آپ کی تعلیمات کا اثر ہے، جو آج بھی انسانیت کے لیے رہنما ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت میں وہ برکات اور وہ نور موجود ہیں، جو تمام جہانوں کا منبع ہیں۔ آپ کی جود و سخا کا انداز ایسا ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب آپ کی زندگی میں ملتا ہے۔ آپ کے افعال کی شان اتنی عمیق ہے کہ اس کا کوئی مشابہ نہیں ملتا۔ آپ کی رہنمائی کی روشنی اتنی پائیدار ہے کہ اس سے روشنی حاصل کرنے والوں کے دل کبھی بھی تاریکی میں نہیں ڈوبتے۔

آپ ﷺ کی شان میں یہ کہنا کہ آپ تمام انبیاء کے امام اور سردار ہیں، ایک ایسا بیان ہے جو کسی بھی لفظ یا جملے میں مکمل طور پر نہیں سماتا، کیونکہ آپ ﷺ کا مقام اور مرتبہ ہر توہین سے بالاتر ہے۔ آپ ﷺ کی عظمت کو صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو حقیقتِ محمد ﷺ کے نور کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں۔

سرابِ ادراک و تسخیرِ امکاں

ماورائیت کے دائرے میں محوِ گردش، میں خواب کی ناپید گہرائیوں میں اترا تو ایک انجانی سرزمین پر خود کو پایا۔ یہ کوئی معمولی خطۂ خاک نہ تھا بلکہ ایک ایسی اجنبی دنیا تھی جہاں نہ سبزہ تھا، نہ کوئی زلالِ آب، نہ کوئی نغمہ سنج پرندہ، نہ کوئی سرسبز درخت۔ ہر سمت خاکستری ریت کے بے کراں ٹیلے، دھند میں لپٹے افق اور دھوپ کی خون آشام تمازت تھی۔

فضا بوجھل تھی جیسے صدیوں سے ہوا کا گذر نہ ہوا ہو۔ یہاں آسمان ایک دہکتے ہوئے سرخ کتبے کی مانند تھا، جس پر کوئی بادل نہ تھا اور نہ ہی کوئی نسیم رواں تھی جو پیاس کی شدت میں کمی کرتی۔ میں ایک تاریک، بے نور غار میں پناہ گزیں تھا جو کسی قدیم داستان کا بھولا بسرا ورق معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سرد پتھریلے در و دیوار پر عجیب و غریب نقوش کندہ تھے، جو کسی نامعلوم تمدن کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ میرے حلق میں تپتے ہوئے انگارے سلگ رہے تھے۔ پانی کی طلب میرے حواس پر حاوی ہو رہی تھی، اور میں اس پیاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر غار سے باہر نکلا۔ نظر دوڑائی تو کہیں دور ایک عظیم الجثہ پہاڑ کی دوسری جانب نیلی روشنی سی جھلملاتی دکھائی دی، گویا وہاں آبِ حیات کا کوئی چشمہ موجزن ہو۔ میں نے اپنے نحیف مگر بے قرار قدموں کو اس سمت بڑھایا۔

راستہ دشوار تھا، ریگزار کی سلگتی ہوئی ریت میرے پیروں کو جلا رہی تھی۔ ہر قدم جیسے کسی آزمائش سے کم نہ تھا، مگر پیاس کی شدت اور اس نیلگوں روشنی کی کشش مجھے رکنے نہیں دے رہی تھی۔ طویل مسافت کے بعد، میں اس دیو ہیکل پہاڑ کے دامن تک پہنچا۔

یہ پہاڑ زمین کے دیگر کوہساروں سے مختلف تھا۔ اس کی سطح کسی قدیم آتش فشاں کے جمود کا پتہ دے رہی تھی، جیسے ہزاروں برس قبل اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ منجمد ہو چکی ہو۔ میں نے چوٹی پر پہنچنے کے لیے

صعود شروع کیا۔ راستہ دشوار تر ہوتا گیا، مگر میری جستجو کم نہ ہوئی۔ بالآخر میں اس چوٹی پر جا پہنچا، اور جو منظر میرے سامنے تھا، اس نے میرے ادراک کو لرزا دیا۔

نیچے ایک سر سبز وادی تھی، مگر یہ عام وادیوں کی طرح نہ تھی۔ درخت بلوریں پتے لیے کھڑے تھے، پانی نیلے چمکدار ذرّات سے لبریز تھا، اور عجیب الخلقت مخلوقات اس فضا میں محوِ پرواز تھیں جنہیں میں نے کبھی کسی کتاب میں پڑھا اور نہ کسی خیال میں تصور کیا۔ ان کے جسم شفاف تھے، ان کی حرکات میں ایک ماورائی لطافت تھی، اور ان کی آنکھوں میں وہ راز پوشیدہ تھے جو شاید کسی بھی انسانی ذہن کی گرفت میں نہ آسکتے۔

میں حیران و پریشان نیچے اترا اور پانی کے قریب جا کر اپنا ہاتھ اس میں ڈالا۔ پانی یخ بستہ تھا مگر اس میں ایک غیر مرئی توانائی کی حرارت بھی تھی۔ جیسے ہی میری انگلیاں اس میں مدغم ہوئیں، ایک لہر سی میرے وجود میں سرایت کر گئی اور میرے سامنے وقت کی سرحدیں دھندلانے لگیں۔

میں نے گردن گھمائی تو میرے عقب میں ایک ہلکی نیلگوں روشنی میں لپٹی ہوئی ہستی ایستادہ تھی۔ اس کا قد کشیدہ تھا، آنکھوں میں روشنی کی جھلک تھی، اور اس کا جسم گویا ہوا میں تحلیل ہونے کے قریب تھا۔

وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی، جیسے میرے وجود کے ہر ذرے کو پرکھ رہی ہو۔

مجھے لگا جیسے میرے شعور میں کوئی نرم مگر پرشکوہ صدا ابھری ہو۔

تم یہاں کیوں آئے ہو

میں لرزیدہ آواز میں بولا، میں نہیں جانتا، شاید میں خواب میں ہوں یا کسی ناقابلِ فہم حقیقت میں

وہ ہستی مسکرائی۔ خواب اور حقیقت کی سرحد صرف تمہاری دنیا کے لیے ہے، یہاں یہ دونوں ایک ہی ہیں

میرے ذہن میں ہزاروں سوالات امڈ آئے۔ میں نے پوچھا، کیا میں واحد انسان ہوں جو یہاں آیا ہے

وہ لمحہ بھر خاموش رہا، پھر گویا میرے شعور میں گونج پیدا ہوئی۔ تم اکیلے ہو مگر پہلے نہیں۔ کئی آئے مگر نہ ٹھہر سکے، کیونکہ ان کی آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ تھیں

میں نے بے یقینی سے کہا، تمہارا مطلب کیا ہے

وہ گویا ہوا، تمہاری دنیا میں وقت اور مکاں ایک لکیر کی طرح ہے، یہاں یہ دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ تم جو دیکھ رہے ہو وہ نہ حال ہے، نہ ماضی، نہ مستقبل۔ یہ سب ایک ہی لمحے میں مقید ہیں

میری روح جیسے کسی نامعلوم خوف میں جکڑ گئی۔ کیا میں واپس جا سکوں گا

وہ مسکرایا۔ واپس کہاں، جب تم یہاں ہمیشہ سے ہو

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں شرابور تھا، میرا سانس تیز تھا، دل کسی انجانے ارتعاش میں لرز رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں تھا، ہر چیز اپنی جگہ موجود۔

یہ خواب تھا یا حقیقت، میں آج تک نہ جان سکا۔

محبت اور فلسفۂ حیات

کائنات اپنی بوقلمونی، وسعت اور نظم و ترتیب میں ایک لطیف مگر موثر قوت کی جلوہ گاہ ہے، جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ جذبہ محض انسانی قلب کی واردات نہیں، بلکہ فلسفۂ حیات کے نہایت دقیق نکات کی کلید ہے۔ محبت ایک ہمہ جہت حقیقت ہے، جو شعورِ انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر ایک اعلیٰ تر ادراک کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

محبت، ازلی حقیقت یا سرابِ تخیل

عہدِ قدیم سے لے کر دورِ جدید تک، مفکرین نے محبت کو مختلف جہات سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ بعض نے اسے محض ایک نفسیاتی تفاعل گردانا، جبکہ بعض نے اسے الٰہی تجلیات کی جھلک قرار دیا۔ مادی فلسفہ اس جذبے کو محض ایک حسیاتی یا کیمیائی تعامل سے تعبیر کرتا ہے، مگر کیا محبت کی بے خودی، اس کی وارفتگی اور اس کا بے لوث ایثار محض عصبی تحریکات اور دماغی کیمیا کا نتیجہ ہے؟

اگر محبت فقط حیاتیاتی مظہر ہوتی تو وہ عروجِ جنون، وہ شعری لطافت، وہ جذب و مستی، وہ فکری معراج اور وہ قربانی و ایثار جو انسانی تاریخ میں ثبت ہے، کہاں سے آتی؟ محبت کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ گہرائی رکھتی ہے۔ یہ عقل و وجدان کا اتصال ہے، یہ قلب و روح کی ہم آہنگی ہے، یہ وہ اسرار ہے جس کے بغیر انسان اپنی ذات کے معنی و مفہوم سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

محبت اور کائناتی نظم

کائنات کی ساخت پر غور کیا جائے تو محبت کی ایک لطیف جھلک ہر شے میں دکھائی دیتی ہے۔ ستاروں کی کشش، سیاروں کی محوری اور مداری گردش، کہکشاؤں کا پھیلاؤ، اور عناصر کا باہمی ربط، یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ تخلیق کی اساس کسی بے روح جمود پر نہیں بلکہ ایک لطیف مگر موثر ہم آہنگی پر قائم ہے۔

قرآنِ حکیم میں بھی اس روحانی ربط اور محبت کی تجلی کو یوں بیان کیا گیا ہے

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ سورہ روم، آیت 21

یہ آیت نہ صرف ازدواجی تعلقات بلکہ کائناتی نظم و ضبط کی ایک عمومی حقیقت پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ہر مخلوق کے درمیان ایک غیر محسوس کشش موجود ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث بنتی ہے۔

محبت، اضطراب، سکون اور جنون

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کئی مدارج اور کیفیات سے گزرتا ہے۔ اس کے مختلف رنگ اور پیرائے ہیں جو انسانی حیات کے مختلف مراحل میں نمایاں ہوتے ہیں۔

حساس محبت : والدین، اولاد، بہن بھائی، اور دوستوں کے درمیان موجود جذبہ، جو انس، التفات اور قربت کا باعث بنتا ہے۔

جنونی محبت : ایک ایسی کیفیات جس میں عاشق اپنی ہستی مٹا کر محبوب میں فنا ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ یہی وہ

جذبہ ہے جو شاعری، تصوف، اور ادب کا بنیادی محرک ہے۔

روحانی محبت: وہ عشق جو انسان کو مادی آلائشوں سے نکال کر ایک اعلیٰ تر حقیقت سے جوڑ دیتا ہے۔ صوفیہ اسے عشقِ حقیقی سے تعبیر کرتے ہیں۔

محبت میں صبر، ایثار اور قربانی کا فلسفہ

محبت میں سب سے عجیب حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ وصل کی نوید نہیں دیتی، بلکہ بعض اوقات ہجر، صبر اور ایثار کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب محبت کا کمال قربانی میں ظاہر ہوتا ہے۔

قربانی کی حقیقت کائنات میں ہر طرف نظر آتی ہے۔ سورج اپنی توانائی کو صرف کر کے زندگی کو برقرار رکھتا ہے، سمندر بادلوں کی تخلیق کے لیے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، اور ماں اپنی راحتوں کو تج کر اولاد کے لیے اپنا وجود وقف کر دیتی ہے۔ یہی اصول محبت میں کارفرما ہے کہ جو محبت قربانی کا جوہر نہیں رکھتی، وہ محض ایک دھوکہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تم ہر گز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک وہ چیز نہ خرچ کرو جسے تم عزیز رکھتے ہو،

سورہ آل عمران، آیت 92

یہ اصول محبت میں بھی کارگر ہے۔ سچی محبت وہی ہوتی ہے جس میں انسان اپنی خواہشات کو محبوب کی مسرت پر قربان کرنے کو تیار ہو۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں محبت کا ادراک فلسفہ بن جاتا ہے اور فلسفہ حقیقت کی روشنی میں ڈھل جاتا ہے۔

محبت اور عقل کا رشتہ

کیا محبت محض ایک فطری جذبہ ہے یا یہ عقل کا ایک مدبرانہ فیصلہ بھی ہو سکتا ہے؟ یونانی فلسفہ میں محبت کو کئی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے، جہاں افلاطون نے اسے جسمانی خواہش سے بلند تر ایک روحانی ارتقا قرار دیا۔ جدید نفسیاتی تحقیق اسے حیاتیاتی تعامل کے تناظر میں دیکھتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا محبت کی گہرائی کو محض ایک کیمیائی تعامل میں سمیٹا جا سکتا ہے؟

اگر محبت فقط ایک دماغی تعامل ہوتی، تو پھر وہ صدیاں پرانی داستانیں، وہ قافیہ بند شاعری، وہ فنا کا تصور، وہ وصل کی آرزو اور ہجر کے آنسو، یہ سب بے معنی ہو جاتے۔ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ایک احساس نہیں، بلکہ ایک مکمل طرزِ فکر اور حیات ہے جو انسان کو خودی، ایثار اور معرفت کی بلندیوں پر لے جا سکتی ہے۔

محبت اور عرفانِ حقیقت

محبت اگر صحیح سمت میں گامزن ہو، تو یہ انسان کو حقیقتِ مطلق تک پہنچا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب میں محبت کو اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ صوفیہ کے ہاں محبت خدا تک پہنچنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، اور تمام اخلاقی تعلیمات کی اساس اسی جذبے پر قائم ہے۔

وہ لوگ جو ایمان لائے، سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں

سورہ بقرہ، آیت 165

یہ حقیقت ثابت کرتی ہے کہ محبت وہ آفاقی قوت ہے جو انسان کو اس کی اصل حقیقت سے روشناس کراتی ہے اور اسے اپنے تخلیقی مقصد کے قریب لے جاتی ہے۔

محبت محض ایک جذبہ نہیں، بلکہ ایک فلسفیانہ اور کائناتی اصول ہے جو انسان کو معنویت عطا کرتا ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو دلوں کو تسخیر کرتی ہے، ذہنوں کو وسعت بخشتی ہے اور روحوں کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔ اگر انسان محبت کے اصل مفہوم کو سمجھ لے، تو نہ صرف وہ اپنی ذات کے اسرار جان سکتا ہے بلکہ کائنات کے رموز کو بھی پا سکتا ہے۔ کیا انسان اس محبت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ہر ذرہ، ہر شے اور ہر رشتے میں موجود ہے، یا وہ محض دنیاوی علائق میں الجھ کر اس حقیقت سے محروم رہے گا؟

عشق کی کیفیات اور اس کا نفسیاتی زاویہ

عشق انسان کی روح کا ایک پیچیدہ اور متنوع تجربہ ہے، جو محض ایک سطحی جذباتی رد عمل نہیں بلکہ ایک گہرا اور ہمہ گیر اندرونی تحول ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو اپنی ذات سے باہر لے جا کر کسی دوسرے شخص یا کسی متعین مقصد میں گم کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے احساسات، خیالات اور اعمال کو مکمل طور پر اس میں ضم کر لیتا ہے۔ عشق کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی مختلف کیفیات اور نفسیاتی اثرات کو گہرائی سے جانچیں۔

عشق کی ابتدائی کیفیات، وجدانی احساسات اور آفاقی تعلقات

عشق کا آغاز عموماً ایک لطیف، نازک اور نہایت گہری کیفیات سے ہوتا ہے۔ جب ایک انسان محبوب کے خیال یا موجودگی کا احساس کرتا ہے، تو اس کی روح میں ایک نئے جہان کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ کیفیت نہ صرف عاطفی ہے بلکہ یہ روح کی سطح پر بھی ایک تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس ابتدائی احساس میں ایک سکون اور ایک اعلیٰ جذبے کا غلبہ ہوتا ہے، جس میں انسان خود کو اس سے باہر کی دنیا سے آزاد اور مکمل طور پر محبوب کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔

یہ تجربہ اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن و دماغ بھی اپنے تمام جذبات و احساسات میں محض محبوب کی آرزو میں محو ہو جاتا ہے۔ ایسے میں عاشق اپنے دل و دماغ کی زبان کو مکمل طور پر محبوب کی خاطر وقف کر دیتا ہے۔ محبوب کی مسکراہٹ، آواز، نگاہ، ہر حرکت میں ایک سحر ہوتا ہے، جو عاشق کے دل میں محبت کی آگ کو مزید بھڑکاتا ہے۔ یہاں تک کہ عاشق کی پوری دنیا اس لمحے میں چھوٹی ہو کر صرف ایک نقطے میں مرکوز ہو جاتی ہے، اور وہ نقطہ محبوب کی موجودگی بن جاتا ہے۔

عشق کی شدت اور اضطراب، روح کی بے چینی

جب عشق کی شدت بڑھتی ہے، تو یہ عاشق کی روح میں اضطراب، بے چینی اور خواہش کی ایک شدت پیدا کر دیتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو دل کی امنگیں اور امیدیں ہیں، لیکن دوسری طرف ایک شدید خوف اور بے یقینی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ جب محبوب دور ہو یا اس کی جانب سے کوئی غیاب ہو، تو یہ بے چینی اپنی انتہاؤں کو چھوتی ہے۔ اس اضطراب میں انسانی ذہن میں بے شمار سوالات اور خدشات پیدا ہوتے

ہیں : کیا محبوب میری محبت کا جواب دے گا؟ کیا ہماری ملاقات ممکن ہوگی؟ اور اس انتظار میں محبوب کا غیاب دل کو بے حد دکھی کرتا ہے۔

عشق میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت ایک ایسی مہم کی طرح ہوتی ہے.جس میں ہر لمحہ ایک نئی امید اور نئی تکلیف کی جڑ ہوتی ہے۔ یہ کیفیت کسی بھی عاشق کے لیے ایک نفسیاتی آزمائش بن جاتی ہے، جہاں وہ اپنے اندر کے خوف اور پریشانیوں کو تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ محبوب کی موجودگی میں سکون اور تکمیل ہے۔ یہ ایک مادی سکون نہیں بلکہ ایک روحانی سکون ہوتا ہے، جو انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر متاثر کرتا ہے۔

خودی کا زوال اور فنا کی تمنا

عشق کی شدت میں ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب عاشق کی خودی ختم ہونے لگتی ہے۔ یہاں خودی کا زوال کوئی منفی یا بدترین چیز نہیں، بلکہ یہ ایک روحانی تصوف کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ عاشق کی روح میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو محبوب کی مرضی اور خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محبوب کی موجودگی میں گم کر دینے کی آرزو کرتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ محبوب کی محبت میں ہی اس کا وجود مکمل ہو سکتا ہے۔

یہ وہ مقام ہوتا ہے جب انسان اپنی تمام تر خواہشات اور آرزوؤں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس کی محبت کا اصل مقصد صرف محبوب کی رضا اور اس کے ساتھ یکجہتی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو فنا کر دینے کی تمنا کرتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک محبوب کی محبت میں ہی اس کی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ

کیفیت انسان کی روحانی بلندی کی علامت بن جاتی ہے، جہاں وہ اپنی جسمانی اور نفسیاتی حیثیت کو مکمل طور پر ترک کر کے محبوب کی ذات میں غرق ہو جاتا ہے۔

عشق اور نفسیات، ذہنی و جسمانی اثرات

عشق انسان کے دماغی اور جسمانی نظام پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب انسان محبت میں ڈوبتا ہے، تو اس کے دماغ میں کیمیائی ردعمل شروع ہو جاتے ہیں جو اس کی جذباتی کیفیات اور ذہنی کیفیت کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ محبت کے جذبے میں مبتلا انسان کا دماغ زیادہ ڈوپامین اور سیروٹونن ہارمون پیدا کرتا ہے، جو خوشی اور سکون کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، آکسیٹوسن کا اخراج بھی ہوتا ہے، جو انسان کو محبوب کے قریب ہونے پر احساسِ سکون اور رشتہ داری کا بڑھاوا دیتا ہے۔

یہ تمام کیمیائی ردعمل عاشق کی جسمانی حالت پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔ جسم میں توانائی کا ایک نیا بہاؤ آتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات، یہ کیمیائی ردعمل اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ انسان کی جسمانی حالت میں واضح تبدیلیاں آ جاتی ہیں جیسے نیند کی کمی، بھوک کا خاتمہ یا جسمانی کمزوری کا سامنا۔ اسی طرح، محبت کی شدت میں انسان کے ذہن میں بے شمار خیالات اور تصورات بوجھ بن جاتے ہیں جو نہ صرف اس کی جسمانی بلکہ نفسیاتی حالت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

محبوب اور عاشق کے درمیان رشتہ، معشوقی اور محبت کا فلسفہ

عشق میں محبوب اور عاشق کے درمیان ایک خصوصی رشتہ قائم ہوتا ہے جو محض مادی تعلقات سے کہیں زیادہ گہرا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ محبوب کی حیثیت صرف ایک فانی فرد کی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسی روحانی

حقیقت کی مانند ہوتا ہے جس سے عاشق کا تعلق بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ محبوب کی موجودگی عاشق کی روح میں ایک نئی جرات پیدا کرتی ہے، اور اس کی زندگی کا مقصد محض محبوب کی رضا اور قربت حاصل کرنا بن جاتا ہے۔

یہ رشتہ ایک متوازن تعلق ہوتا ہے جس میں دونوں کے جذبات، خواہشات اور آرزوئیں آپس میں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ عاشق کا دل اپنے محبوب کی جانب مائل ہوتا ہے، جبکہ محبوب کی محبت میں عاشق کو سکون ملتا ہے۔ یہ رشتہ صرف جذباتی نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ جب عاشق محبوب کے قریب ہوتا ہے، تو اس کی شخصیت میں ایک نیا رُخ آتا ہے۔

قرآنی تناظر میں عشق کی حقیقت

قرآن مجید میں اللہ کی محبت کو سچی محبت قرار دیا گیا ہے، اور یہ محبت ہر فانی محبت سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے۔ اس محبت میں انسان کی روح کی تکمیل اور حقیقت کی گہرائی چھپی ہوتی ہے۔ اللہ کی محبت انسان کی زندگی کا مقصد ہوتی ہے، اور اس محبت میں انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے رب کے حکم میں راضی ہوتا ہے۔

کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔ سورہ آل عمران، آیت 31

یہ آیت ہمیں اس بات کی طرف رہنمائی دیتی ہے کہ عشق کی اصل حقیقت اللہ کی رضا اور اس کی محبت میں پوشیدہ ہے۔ عشق کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لیے، انسان کو اپنے محبوب کی محبت میں غرق ہونے کی بجائے اللہ کی محبت میں سچائی اور یقین کے ساتھ غرق ہونا چاہیے۔

حتمی تجزیہ

عشق کی حقیقت اور اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنا ایک گہری اور شفاف نظر کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کی روح اور شخصیت کو پوری طرح تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان جب محبوب کی محبت میں محو ہوتا ہے، تو اس کا دل ایک خاص سکون اور جوش سے بھر جاتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ایک درد، اضطراب اور بے چینی کی کیفیت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی نفسیاتی اور روحانی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اس میں سچائی، قربانی، اور محبت کی بے لوث کیفیت پوشیدہ ہے جو انسان کو اپنی حقیقت اور مقصد کے قریب لے آتی ہے۔

عشق، سراب یا حقیقت؟ (ایک مکالمہ)

کردار

حارث، ایک فلسفیانہ ذہن رکھنے والا مفکر، جو عشق کو محض ایک فریبِ حواس سمجھتا ہے۔

سلیم، ایک صوفی مزاج عاشق، جو عشق کو روح کی معراج گردانتا ہے۔

نیاز، ایک دنیوی عاشق، جو مجازی محبت کو ہی حقیقی تسکین سمجھتا ہے۔

منظر

چاندنی رات، ایک خاموش باغ، جہاں تینوں دوست ایک پرانے پتھر کے بینچ پر بیٹھے ہیں۔ چاندنی کی مدھم روشنی درختوں کے پتوں سے چھن کر نیچے گر رہی ہے۔ ہلکی ہوا میں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ دور کہیں کسی بلبل کی آہ و زاری سنائی دے رہی ہے۔

مکالمہ

حارث: (گہری سانس لیتے ہوئے)

یہ عشق آخر کیا بلا ہے؟ محض ایک کیمیاوی تفاعل؟ یا انسانی شعور کا خودساختہ سراب؟ کوئی کہتا ہے یہ روح کی پیاس ہے، کوئی اسے جنون قرار دیتا ہے، مگر میں تو اسے محض وہم و گمان کا تسلسل سمجھتا ہوں، ایک ایسی کیفیت جو انسان کو فکری انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔

سلیم: (مسکراتے ہوئے)

حارث! تمہاری فکر ہمیشہ مادیت کی زنجیروں میں جکڑی رہتی ہے۔ عشق نہ کوئی کیمیاوی ردِّ عمل ہے، نہ ہی ذہنی فریب۔ یہ وہ راز ہے جو دل کی وادیوں میں کھلتا ہے اور عقل کی سلطنت پر حکمرانی کرتا ہے۔ جس نے عشق کی آگ میں خود کو جھونک دیا، وہی حقیقت سے روشناس ہوا۔

نیاز: (تلخی سے)

حقیقت؟ حقیقت تو یہ ہے کہ عشق ایک امتحان ہے، جس میں اکثر ناکامی مقدر بنتی ہے۔ کوئی اپنی محبت کو پا کر بھی تہی دامن رہتا ہے، اور کوئی نہ پا کر بھی امر ہو جاتا ہے۔ کوئی وصل کی لذت سے سیراب ہوتا ہے، تو کوئی ہجر کے زہر میں بجھ کر فنا ہو جاتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟

حارث: (زیرِ لب ہنستے ہوئے)

نیاز، تمہاری تلخی تمہارے تجربے کی تلخ نوائی کا پتہ دے رہی ہے۔ مگر سوچو، وہ جو کسی کی محبت میں فنا ہو جاتا ہے، وہ آخر حاصل کیا کرتا ہے؟ کیا وصل اور فراق کی کشمکش میں مبتلا رہنا ہی حیات کی معراج ہے؟

سلیم: (گہری نظر سے حارث کو دیکھتے ہوئے)

حارث! عشق محض وصل و فراق کا نام نہیں، یہ تو وہ نکتہ ہے جو انسان کو اس کی حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ تم عشق کو کیمیاوی تعامل کہہ کر اس کی روحانی عظمت کو کم نہیں کر سکتے۔ عشق وہ آتش ہے جو دلوں کو جلائے بغیر روشنی دیتا ہے، جو آنکھوں میں آنسو رکھ کر بھی سکون بخشتا ہے۔

نیاز: (دھویں میں گم نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے)

مگر سلیم، عشق کے دو چہرے ہیں۔ ایک وہ جو مسرت بخشتا ہے، اور دوسرا وہ جو دل کو نوچ کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی عشق کی مسرت میں جیتا ہے، کوئی اس کے زخم سہتا ہے۔ کسی کو محبوب کی قربت نصیب ہوتی ہے، تو کوئی عمر بھر تڑپتا رہتا ہے۔ کسی کا عشق مقامِ رضا تک پہنچ جاتا ہے، اور کسی کا شکوہ و شکایت میں گزر جاتا ہے۔

حارث: (طنزیہ انداز میں)

اور پھر کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جو کسی محبوب کے مل جانے کے بعد بھی بے چین رہتے ہیں۔ کیا یہی عشق کا حاصل ہے؟ اضطراب اور بے قراری؟

سلیم: (مسکراتے ہوئے)

یہ اضطراب اور بے قراری ہی عشق کا جوہر ہے۔ جو عشق میں سیراب ہو گیا، وہ عشق کی وادی میں بھٹکا ہی نہیں۔ دیکھو، تم عشق کو مادی پیمانوں سے ناپ رہے ہو، جبکہ عشق وہ سرمدی نغمہ ہے جو ازل سے گونج رہا ہے اور ابد تک گونجتا رہے گا۔

نیاز: (سوچتے ہوئے)

اگر عشق اتنا ہی سرمدی ہے، تو پھر یہ دل شکستہ کیوں کرتا ہے؟ کیوں جدائی کی آگ میں جلا دیتا ہے؟ اگر محبت حقیقی تسکین ہے تو وصل کے بعد بھی انسان بے چین کیوں رہتا ہے؟

سلیم : (گہری سانس لیتے ہوئے)

یہی تو عشق کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ جو محبوب کو پا کر بھی بے چین رہا، وہ ابھی عشق کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ عشق وہ آئینہ ہے جو انسان کو اس کے اصل چہرے سے روشناس کراتا ہے۔ جس نے عشق کو سمجھ لیا، وہ شکوے سے آزاد ہو گیا، اور جو شکوہ کرتا رہا، وہ عشق کے راز تک پہنچا ہی نہیں۔

حارث : (گہرے تفکر میں)

تو کیا وہی عشق حقیقی ہے جو شکوے سے بالاتر ہو؟

سلیم : (مسکراتے ہوئے)

بالکل! وہی عشق سچا ہے جو نفس کی قید سے آزاد کر دے، جو محبوب کی ذات میں فنا ہونے کا ہنر سکھا دے، جو شکوے سے بالاتر ہو کر تسلیم و رضا کا جام پلا دے۔ یہی عشق کی معراج ہے، یہی حقیقت کا راز!

دور مؤذن کی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے، تینوں دوست خاموش ہو جاتے ہیں، جیسے اس صدا میں کوئی ایسا پیغام چھپا ہو جو ان کے سوالوں کا جواب ہو۔ رات کی خاموشی مزید گہری ہو جاتی ہے، اور چاند کی روشنی باغ کے درختوں پر لرزنے لگتی ہے۔

دنیاداری، محبت، عشق کی منزلوں کا سفر

عشق کی راہ میں جو منزلیں ہیں، وہ انسان کی روحانی، جذباتی اور فکری نشوونما کے مراحل کی مانند ہیں۔ ہر منزل ایک نیا تجربہ، ایک نیا انکشاف اور ایک نیا جذبہ پیش کرتی ہے، جو انسان کو اپنی اصل حقیقت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ یہ منزلیں ایک تسلسل کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں اور ہر ایک منزل کی اہمیت اپنی جگہ پر گہری ہوتی ہے۔ ان منزلوں کا گزرنا ایک طویل اور کٹھن سفر ہے، جس میں انسان کی حقیقت کی دریافت، محبت کی گہرائی، اور روحانی سکون کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

ذیل میں ہر منزل کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو عشق کے مختلف مراحل اور انسان کے اندر کی کیفیت کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ تفصیل آپ کو ان مختلف مراحل کی سمجھ بوجھ فراہم کرے گی اور آپ کو بتائے گی کہ کس طرح ہر منزل اگلی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

طلب، اضطرابِ اولین

طلب، دراصل وہ مکتوم آتش ہے جو قلب کے نہاں خانوں میں دبے دبے سلگتی رہتی ہے، ایک ایسا نامیرا اضطراب جو سکون کی ہر تمنا کو متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ وہ پہلی چنگاری ہے جو دل کی وادی میں ناآسودگی کی بادِ سموم چلا دیتی ہے اور ایک ایسی بے نام جستجو کو جنم دیتی ہے جو ابتدا میں بے سمت نظر آتی ہے، مگر درحقیقت، یہ اولین قدم ہے ایک لازوال کشش کے مدار میں داخل ہونے کا۔

یہ وہی کیفیت ہے جو صوفیا کے دل میں عشقِ حقیقی کی جوت جگاتی ہے، جو عارف کو ناآشنا راستوں پر چلنے کی جرأت عطا کرتی ہے، جو عاشق کو اس کے سکون سے محروم کر کے بے قراری کی وسعتوں میں دھکیل دیتی

ہے۔ طلب کی زمین پر جب قدم پڑتا ہے تو راحت کی ہر صورت بے مایہ لگنے لگتی ہے، ہر لمحہ ایک انجانی تشنگی میں تحلیل ہو جاتا ہے، اور وجود اپنی ہی ہستی سے برسرِ پیکار ہونے لگتا ہے۔

یہ وہ زہرِ شیریں ہے جو جسم و جاں میں اتر کر ہر شے کو غیر محسوس کر دیتا ہے، سوائے اُس کے جس کی جستجو میں طلب نے اپنا پنجہ گاڑ رکھا ہے۔ یہ وہ دبی ہوئی صدا ہے جو ہر لمحہ دل کے نہاں خانے میں گونجتی رہتی ہے، ایک خاموش فریاد جو ہر لفظ میں، ہر نظر میں، ہر سوچ میں پنہاں ہو جاتی ہے۔ یہ وہی واردات ہے جو مجنوں کو صحرا نورد کر دیتی ہے، فرہاد کو تیشہ زنی پر مائل کرتی ہے، منصور کو انا الحق کی سرحدوں تک پہنچاتی ہے، اور رومی کو شمس کے گرد دیوانہ وار رقص پر مجبور کر دیتی ہے۔

طلب کے لمحے ابتدا میں نازک ہوتے ہیں، مگر یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عشق کی آبیاری ہونے لگتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب ہر حقیقت بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے، ہر منظر محو، ہر خیال پژمردہ، ہر تعلق ہیچ۔ طلب جب شدت اختیار کرتی ہے تو روح میں ایک عجیب سی بے قراری سما جاتی ہے، دل میں ایک ایسی خلش ابھرتی ہے جو کسی بھی ظاہری سیرابی سے بجھنے سے انکاری ہوتی ہے۔

یہی وہ اضطراب ہے جو انسان کو دو راہوں میں لا کھڑا کرتا ہے، یا تو وہ اس تپش کو بجھانے کے لیے کسی مصنوعی تسکین کا سہارا لے، یا پھر وہ اس شعلے کو دہکنے دے، یہاں تک کہ یہ آگ اُسے ہر غیر ضروری وابستگی سے جلا کر خاکستر کر دے۔ جو اس آگ میں جلتا ہے، وہ فنا ہو کر بقا پاتا ہے، اور جو اس آگ سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے، وہ ہمیشہ ناآسودہ رہتا ہے۔

یہ طلب ہی ہے جو انسان کو حقیقت کے در تک لے جا سکتی ہے، اگر وہ اس کی راہ میں استقامت اختیار کرے۔ یہ طلب ہی ہے جو اسے عشق کے ان مدارج پر فائز کر سکتی ہے جہاں ذات کی نفی اور معشوق کی

اثبات کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہی طلب ہے جو ایک عام مسافر کو مجذوب بنا دیتی ہے، ایک عام انسان کو فنا فی اللہ کی منازل پر گامزن کر دیتی ہے۔

طلب محض ایک خواہش نہیں، یہ ایک انقلاب ہے، ایک زلزلہ جو دل کی سرزمین کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، ایک سیلاب جو ہر غیر ضروری شے کو بہا کر لے جاتا ہے، ایک آندھی جو تمام عارضی تمناؤں کے چراغ گل کر دیتی ہے۔ اور جب یہ اپنے عروج کو پہنچتی ہے، تو پھر انسان کسی بھی شے کا محتاج نہیں رہتا، سوائے اُس کے، جس کی جستجو میں وہ ہمہ وقت تپتا رہا۔

یہی وہ کیفیت ہے جسے صوفیاء نے سوزِ دروں کہا، یہی وہ بے تابی ہے جسے عارفوں نے سرِّ نہاں کا پہلا دروازہ قرار دیا، یہی وہ آتش ہے جسے عشق کا ابتدائی لمحہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں منزل کا پہلا نشان دکھائی دیتا ہے، اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں سے راستہ دشوار تر ہونے لگتا ہے۔ لیکن جو اس راستے پر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے، وہی بالآخر وہی کچھ پا لیتا ہے جس کے لیے وہ جلتا رہا، تڑپتا رہا، اور تمام دنیاوی علائق سے ناتا توڑتا رہا۔

یہی طلب ہے، آغازِ عشق، ابتداءِ جنون، پہلا دروازہ فنا کی دہلیز کا، اور اولین نسخہ بقا کے راز کا۔

الفت، سرمدی کشش کی ناقابلِ فراموش روداد

الفت، وہ لازوال کشش ہے جو روح کی پہنائیوں میں ایک خاموش ارتعاش برپا کر دیتی ہے، ایک غیر مرئی رشتہ جو دلوں کے مابین نادیدہ دھاگوں کی مانند بُنا جاتا ہے، اور جس کی گرفت نہ تو زمانی قیود سے آزاد ہے اور

نہ ہی مکانی حدود سے مشروط۔ یہ وہ لطیف مگر ہمہ گیر جذبہ ہے جو نہ فقط ظاہری قربت میں نمو پاتا ہے، بلکہ بسا اوقات فاصلوں کی گہرائیوں میں اپنی انتہاؤں کو پہنچ کر تکمیل پاتا ہے۔

یہ وہی جذبۂ سرمدی ہے جس کی لطافت ہر گرم و سرد، ہر خوشی و غم، ہر وصال و فراق میں یکساں جلوہ گر رہتی ہے۔ الفت کسی سطحی رجحان کا نام نہیں، یہ محض ایک زود گزر جذبہ نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی روحانی وابستگی ہے جو وجود کے ہر گوشے میں اپنی موجودگی کا احساس کراتی ہے۔ یہ وہ گہرائی ہے جو کسی بھی مصنوعی یا عارضی محبت سے ماورا ہو کر، ایک ایسے تعلق میں تبدیل ہو جاتی ہے جو فنا کے تمام خدشات سے بالاتر ہوتا ہے۔

الفت، در حقیقت، طلب سے آگے کا مرحلہ ہے۔ اگر طلب ایک تپش ہے تو الفت وہ پرسوز چراغ ہے جو دل کی ویران راہداریوں میں ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا جاتا ہے۔ اگر طلب اضطراب ہے، تو الفت ایک ایسا گداز ہے جو وجود کو نرمی اور سکون کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر طلب جلانے والی آتش ہے، تو الفت وہ دیپ ہے جس کی روشنی سے عاشق کے تمام اندھیرے منور ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ الفت میں دراصل استقامت اور وفاداری کی آزمائش ہے۔ یہ محض ابتدائی جذبات کی ہلچل نہیں، بلکہ ایک دائمی پیمان ہے جو دل کی سلطنت پر ہمیشہ کے لیے حکمرانی قائم کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا میثاقِ ازلی ہے جو نہ وقت کے گزرتے موسموں سے ماند پڑتا ہے، نہ مصائب کی آندھیوں سے شکستہ ہوتا ہے، اور نہ ہی دنیاوی بے ثباتیوں کے زیرِ اثر زوال پذیر ہوتا ہے۔

الفت کی سب سے لطیف اور دلگداز شکل وہ ہے جب یہ مجازی سے حقیقی میں تبدیل ہو جائے۔ ابتدا میں انسان کسی ہستی، کسی صورت، کسی خیال، یا کسی احساس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، لیکن جیسے جیسے یہ تعلق پروان چڑھتا ہے، دل میں یہ یقین مستحکم ہونے لگتا ہے کہ اصل محبت کسی فانی شے سے نہیں، بلکہ

اُس ذات سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کی منبع و منتہا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب الفت کی حقیقت آشکار ہوتی ہے، اور عاشق جان لیتا ہے کہ ہر محبت، ہر تعلق، ہر کشش، ہر التفات، دراصل ایک ہی مرکز پر منتج ہوتا ہے، اور وہ ہے عشقِ حقیقی۔

الفت کی ایک نمایاں خاصیت اس کی بے لوثی ہے۔ یہ کسی صلے، کسی انعام، کسی غرض یا کسی خواہش کی قید میں نہیں آتی۔ یہ محض دینا جانتی ہے، لینا اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ الفت میں محبوب کی رضا ہی عاشق کی معراج ہوتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان اپنی ذات کے تمام تقاضے پسِ پشت ڈال کر محبوب کے ہر احساس، ہر چاہت، ہر خوشی، ہر تکلیف میں اپنی ہستی کو تحلیل کر دیتا ہے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جب الفت کا پیکر سراپا ایثار بن جاتا ہے، اس کی زبان سے کوئی شکوہ صادر نہیں ہوتا، اس کے لبوں پر صرف صبر کا امرت ٹپکتا ہے، اس کی آنکھوں میں فقط یقین کی روشنی جھلملاتی ہے۔ الفت میں محبوب کی خوشی، عاشق کے لیے عبادت بن جاتی ہے، اور اس کے دکھ، عاشق کے لیے آزمائش۔

الفت جب کامل ہو جائے، تو ہر جذبہ، ہر احساس، ہر خیال، محبوب کی ذات میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب عاشق اور معشوق کے مابین ہر حجت مٹ جاتی ہے، ہر پردہ اٹھ جاتا ہے، ہر دیوار ڈھ جاتی ہے، اور صرف ایک ہی حقیقت باقی رہتی ہے، ایک اٹوٹ بندھن، ایک لافانی تعلق، ایک سرمدی عشق۔

الفت، وہ نور ہے جو قلب کی تاریکیوں کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا ہے، وہ جام ہے جسے پی کر عاشق کبھی پیاسا نہیں رہتا، وہ آغوش ہے جس میں سما کر ہر دکھ، ہر خلش، ہر تڑپ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ الفت، وہ راستہ ہے جو اگر سچا ہو، تو بالآخر حقیقت کے در تک پہنچا دیتا ہے، اور اگر ادھورا رہ جائے، تو صدیوں کی اداسی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

یہی الفت کا فلسفہ ہے، یہی اس کی معراج، یہی اس کا راز—جو جان لے، وہ فنا میں بقا پا لیتا ہے، اور جو نہ سمجھ سکے، وہ ہمیشہ طلب اور بے قراری کے صحراؤں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

مودّت، سرمدی الفت کی ایک لطیف تجلی

مودّت وہ نادیدہ بندھن ہے جو دلوں کے مابین ایک غیر محسوس مگر ناقابلِ انکار تعلق قائم کر دیتا ہے، وہ لطیف مگر مستحکم رشتہ جو ظاہری وابستگی سے کہیں آگے، کہیں گہرے معانی رکھتا ہے۔ یہ محض عارضی کشش یا فانی جذبات کا تلاطم نہیں، بلکہ یہ ایک ایسے تعلق کی بُنت ہے جو دوام کی سرحدوں کو چھوتا ہے۔

محبت کی لطافتوں میں اگر جذبات کا سیلِ رواں بہتا ہے تو مودّت اس سیلاب کو ایک پختہ بند عطا کرتی ہے، اسے استحکام بخشتی ہے، اسے وقتی لذتوں اور وقتی آزمائشوں سے ماورا کر کے، ایک ناقابلِ تسخیر حصار میں بدل دیتی ہے۔ مودّت کی جڑیں عشق کی زمین میں گہری اتری ہوتی ہیں، مگر اس کے ثمرات ہمیشہ صبر، تحمل، ایثار، وفا اور قربانی کے خمیر سے گندھے ہوتے ہیں۔

یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو نہ صرف قربتوں میں پروان چڑھتا ہے بلکہ فاصلوں کی طوالت بھی اس کی شدت کو ماند نہیں کر سکتی۔ یہ محض ایک شدید احساس نہیں بلکہ ایک ایسی فکری اور روحانی پختگی ہے جس میں محبوب کی خوشی، راحت اور بقا کو اپنی ذات سے زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ مودّت ایک ایسی روشنی ہے جو تعلق کی راہوں میں ہر تاریکی کو مٹا دیتی ہے، ایک ایسا سکون ہے جو اضطراب کے سمندر کو تھما دیتا ہے، ایک ایسا سجدہ ہے جو محبوب کی مسرت میں اپنی تمام تر ہستی کو فنا کر دیتا ہے۔

اگر محبت ایک ابتدائی تپش ہے تو مودّت وہ شعلہ ہے جو جلا کر راکھ نہیں کرتا، بلکہ منور کر دیتا ہے۔ اگر عشق ایک دریا ہے تو مودّت وہ کنارہ ہے جو اسے حدود میں رکھ کر، اسے بے لگام بہاؤ سے محفوظ کر دیتا ہے۔ محبت میں شدت ہے، مگر مودّت میں وقار ہے۔ محبت میں بے قراری ہے، مگر مودّت میں ٹھہراؤ ہے۔ محبت میں جذبات کی تندی ہے، مگر مودّت میں احساسات کی گہرائی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مودّت محض طلب یا بے تابی کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک متوازن، ٹھوس اور پختہ تعلق کی علامت ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو نہ وقت کے تھپیڑوں سے ماند پڑتا ہے، نہ مصائب کی یلغار اسے کمزور کر سکتی ہے۔ یہ وہ استقامت ہے جو وفاداری کو ایک فکری اور عملی اصول میں ڈھال دیتی ہے، جو ہر آزمائش میں مضبوطی سے کھڑی رہتی ہے، جو نہ بدگمانی سے لرزتی ہے، نہ ہی دنیاوی فریبوں کے ہاتھوں متزلزل ہوتی ہے۔

مودّت کی سب سے بڑی پہچان اس کی بے غرضی ہے۔ یہ کسی مفاد، کسی غرض، کسی دنیوی تمنا کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو ہر صورت میں اپنا وجود برقرار رکھتی ہے، چاہے محبوب قریب ہو یا دور، چاہے وقت مہربان ہو یا مخالف، چاہے قسمت ہم آہنگ ہو یا نامہربان۔

اگر مودّت کو ایک آئینہ تصور کیا جائے تو اس میں صرف وفا کا عکس دکھائی دے گا، اگر اسے ایک چراغ سمجھا جائے تو اس کی لو ہمیشہ ایثار کی روشنی سے منور رہے گی، اگر اسے ایک راہ گزر مانا جائے تو اس کی منزل فقط محبوب کی دائمی راحت ہوگی۔

یہی وہ جذبہ ہے جو دنیا کے ہر نفع و نقصان، ہر فراق و وصال، ہر شکست و کامیابی سے بلند ہو کر، محض ایک چیز پر قائم رہتا ہے، اخلاص۔ اور جب مودّت کا یہ اخلاص کامل ہو جائے تو محبوب اور محب کے مابین ایک

ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جسے نہ کوئی وقت مٹا سکتا ہے، نہ کوئی حادثہ شکست دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی فاصلہ ختم کر سکتا ہے۔

یہی مودّت کی معراج ہے، یہی اس کا حسن، یہی اس کا راز۔ جو اسے سمجھ لے، وہ حقیقی تعلق کی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے، اور جو اسے نہ پا سکے، وہ محبتوں کی ناپائیداری میں بھٹکتا رہتا ہے۔

عشق، وجود کا لاہوتی تمازت

عشق ایک ایسا سماں ہے جس میں انسان اپنی تمام تر حدود اور تعصبات کو پار کر کے، کسی بے کنار، بے انتہا، اور غیر متناہی جذبے کی لذت میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ محض جسمانی یا نفسیاتی تعلقات کا شاخسانہ نہیں، بلکہ روح کے اُس مقام کی تکمیل ہے جہاں انسان اپنی ذات سے برتر ہو کر ایک معشوقِ حقیقی کی تکمیل میں غم اور خوشی کے مفہوم کو عبور کرتا ہے۔

عشق کی حقیقت کو صرف الفاظ میں نہیں سمویا جا سکتا، کیونکہ یہ احساسات کے ایک ایسے دریچے سے جڑا ہے جس کا سراغ زبان، علم یا عقل کے کسی پیمانے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ وہ آگ ہے جو دل کی دھڑکن کو بے چین کر دیتی ہے، وہ بادل ہے جو روح کی فضاؤں میں دریا کے مانند گزر جاتا ہے، اور وہ ہوا ہے جو ہر سانس میں محبوب کی یاد کی خوشبو بھر دیتی ہے۔

عشق کی گہرائی اس کی شدت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک جوش یا عارضی لذت نہیں بلکہ ایک ایسا تسلسل ہے جو انسان کے وجود کو پوری طرح متحرک کر کے اسے سچائی اور معصومیت کی طرف راہنمائی کرتا

ہے۔ عشق دراصل انسان کی داخلی کیفیت کا آئینہ دار ہے، یہ اس کی روحانی بیداری، اس کے فطری تعلق کا عکاس ہے جو اسے اپنی تخلیق، اپنے خالق، اور اپنے معشوق کے ساتھ جوڑتا ہے۔

عشق کی منزلیں بے شمار ہیں، مگر ہر منزل ایک نیئ کرب وراحت کا نشان ہوتی ہے۔ یہ ایک جادوی کیفیت ہے جو شروع میں لذت اور خواہش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، مگر پھر وقت کے ساتھ اس میں ایسی خود سپردگی آتی ہے کہ انسان اپنی تمام تر خواہشات اور تمناؤں کو معشوق کے قدموں میں قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اپنے نفس کو معشوق کے اندر دیکھنے لگتا ہے، اور ہر حال میں اسے اپنے آپ سے زیادہ عزیز جاننے لگتا ہے۔

یہ عشق کی وہ حقیقت ہے جس میں انسان محبوب کی موجودگی کو اپنی ذاتی زندگی کی تمام تر حقیقتوں سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اس میں لذت نہیں، صرف تسلیم ہے، اس میں طلب نہیں، صرف یقین ہے، اور اس میں ہر کرب، ہر تکلیف اور ہر رنج محبوب کی خوشی کے عوض تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ وہ راز ہے جس سے دلوں کی دنیا مہک اٹھتی ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس میں انسان اپنا ہر تعلق محض معشوق کی رضا کے لیئے قربان کر دیتا ہے۔

عشق کی یہ سچی لذت وہ ہے جو انسان کو غیر متوقع طور پر اس کی حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہے، وہ حقیقت جو نہ صرف معشوق کی جمالیات میں پنہاں ہوتی ہے بلکہ وہ کائینات کی حقیقت میں بھی رچی ہوتی ہے۔ حقیقت کا یہ ادراک صرف عشق کی شدت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب انسان اپنے دل کی ہر رگ میں یہ سچائی محسوس کرتا ہے کہ میں نہیں ہوں، بلکہ وہ ہے، تو وہ عشق کے اس نہ ختم ہونے والے دائرے میں غرق ہو جاتا ہے۔

عشق کی دنیاء میں ہر بات کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ محبت کی تعریف صرف ایک لذت یا کسی کی طرف مائل ہونے کی نہیں رہتی، بلکہ یہ ایک روحانی تعلق بن جاتی ہے جس میں انسان خود کو پگھلا کر معشوق کی ذات میں ضم کر دیتا ہے۔ اس میں قربانی کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے، یہ محض کسی چیز کا چھوڑ دینا نہیں، بلکہ اپنی ہستی کا معشوق کے لیے گم کر دینا ہوتا ہے۔

عشق کی کوئی حقیقت نہیں، یہ محض ایک تسلیم و رضا ہے، ایک ایسا انکشاف ہے جس میں انسان اپنی ساری محنت، ساری کوششیں، ساری کمزوریاں، اور اپنی تمام تر طاقتیں معشوق کی قدموں میں نچھاور کر دیتا ہے۔ اس میں دھوکہ نہیں، اس میں فریب نہیں، اور نہ ہی اس میں کسی بھی قسم کا ابہام ہوتا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جو دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر انسان کو معشوق کی حقیقت میں غرق کر دیتی ہے۔

عشق کی یہ کشش اور جذبہ اسے ہر شے سے ماوراء بنا دیتی ہے۔ یہ کسی وقت کی حدود میں نہیں ہے، نہ ہی کسی مقام کے قید میں ہے۔ یہ ایک ایسا لاہوتی تمازت ہے جو انسان کے روحانی ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ یہ وہ لذت ہے جس میں ہر کام اور ہر شے کا مقصد فقط معشوق کی رضا اور محبت میں ڈھل جاتا ہے۔

یقیناً عشق کی یہ آفاقیت ہمیں اس مقام تک پہنچاتی ہے جہاں ہم اپنی ذاتی حقیقتوں سے آگے بڑھ کر، اللہ کے ساتھ ایک ابدی تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ عشق کی یہ حقیقت ایک ایسی قوت بن جاتی ہے جو انسان کے قلب کو اپنی محبت سے نورانی کر دیتی ہے، اور اس کے وجود کو آسمانی سکون سے بھر دیتی ہے۔

ہَوَس، خواہشات کا اندھیرا معمہ

ہَوَس انسان کے قلب اور عقل کی ایسی منحرف حالت ہے جو اس کی فطری جبلتوں، خواہشات اور نفسیاتی سطح کی گہری تاریکیوں سے جنم لیتی ہے۔ یہ کوئی محض جسمانی یا نفسانی لذت کی طلب نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ

اور مصلحتوں سے بھری ہوئی جذبۂ آرزو ہے، جو انسان کو اس کی ارفع اور بلند مقاصد سے ہٹا کر محض عارضی، فانی اور خسارے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہَوَس ایک بے قابو جذبہ ہے، جو انسان کو نہ صرف اپنے اندر کی خرافات اور بدبودار خواہشات سے آشنا کرتا ہے، بلکہ اس کی روحانیت، اخلاق اور معقولیت کو بھی متاثر کرتا ہے۔

ہَوَس کا آغاز انسانی فطرت کی بدلے ہوئی شکلوں سے ہوتا ہے، جہاں انسان اپنی حقیقت سے بے خبر ہو کر، نفسانی تسکین کی دلدل میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو فرد کو اس کے حقیقی مقصد اور مقصدِ حیات سے منحرف کرتا ہے اور اسے عارضی لذتوں میں اس قدر محو کر دیتا ہے کہ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں جا کر اپنی تقدیر کو بھلا بیٹھتا ہے۔

ہَوَس کی جڑیں انسان کی بے قابو خواہشات میں پوشیدہ ہیں۔ یہ وہ آرزو ہے جو اسے عیش و آرام کی دنیا میں اس قدر مگن کر دیتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے فطری حدود کو تجاوز کرتا ہے، بلکہ اس کی روحانی بلندیوں تک پہنچنے کی ساری راہیں بھی مسدود ہو جاتی ہیں۔ ہَوَس کی حالت میں انسان اپنی اصل حقیقت کو پسِ پشت ڈال کر، محض خودی کی تسکین کے پیچھے بھاگتا ہے۔ یہ صرف نفس کا تسکین نہیں، بلکہ ایک داخلی درد، جستجو اور اندھیروں کا عکس ہے جو انسان کو حقیقت کی روشنی سے دور کر دیتا ہے۔

ہَوَس کا مفہوم محض خواہشات کے پیچھے دوڑنا نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا مہیب جال ہے جس میں انسان اپنی اخلاقی اور روحانی حرکات کو محدود کر لیتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کے مطابق نہیں ہے، بلکہ انسان کے اندر کسی باطنی تضاد یا خواہش کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسی گمراہی ہے جو انسان کے وجدان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، اسے اس کی اصل تقدیر سے منحرف کرتی ہے، اور اسے محض عارضی خوشیوں اور نفسانی تسکین میں پھنسا دیتی ہے۔

ہَوَس کا تعلق نہ صرف انسان کے جسم سے ہے، بلکہ اس کی ذہنی اور روحانی حالت سے بھی ہے۔ جب انسان کی روح میں سکون کی کمی ہوتی ہے، جب اس کی فطری ضروریات کا پورا ہونا متعین نہیں ہوتا، تو وہ ہَوَس کے شکنجے میں آجاتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنی شہوات کی تسکین کے لیئے، ہر اصول وضابطے کو نظرانداز کر دیتا ہے، اور اپنی بے قابو خواہشات کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتا ہے۔

ہَوَس کی حقیقت میں اس کی جڑیں خواہشات کے اضطراب میں پنہاں ہیں، اور یہ اضطراب انسان کو اندر سے بے چین کر دیتا ہے۔ یہ اضطراب انسان کو اپنی اصل حقیقت، یعنی روحانی سکون اور قلبی اطمینان سے دور کرتا ہے، اور اسے دائمی سکون کی بجائے محض عارضی خوشی کے فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب انسان اپنی ہَوَس کو قابو پانے میں ناکام رہتا ہے، تو اس کی زندگی میں ایک خلا اور بے سکونی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو اس کے ذہنی وجسمانی سکون کو متاثر کرتی ہے۔

یہ کیفیت اس قدر مہیب اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے اندر کی خواہشات اور تمناؤں کی بے قابو شدت میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے روحانی اور اخلاقی تصورات سے منحرف ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی اجتماعی زندگی اور معاشرتی رشتہ بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ہَوَس انسان کو ایک سطحی، غیر فطری اور ناقص زندگی کی طرف لے جاتی ہے، جو نہ صرف اسے داخلی سکون سے عاری کرتی ہے بلکہ اس کی تکمیل اور معنویت کو بھی ماند کر دیتی ہے۔

جب ہَوَس کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ ایک گہری تنہائی اور اضطراب کا باعث بنتی ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں انسان اپنی خوشی، سکون اور زندگی کے اصل مقصد سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں انسان کی ہر خواہش محض جسمانی تسکین کی طلب بن کر رہ جاتی ہے، اور وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے سکون اور اطمینان کو فراموش کر دیتا ہے۔

ہَوَس کی شدت میں مبتلا انسان کبھی بھی خود کو تسلی اور سکون کی حالت میں محسوس نہیں کرتا۔ اس کے اندر ہمیشہ ایک کمی کی شدت، ایک اضطراب کی لہریں، اور ایک ادھورے پن کا احساس رہتا ہے، جو اس کی روحانیت اور اخلاقی بقا کے لیے ایک سنگین خطرہ ہوتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے بچنے کی ہر انسان کو سعی کرنی چاہیے، تاکہ وہ اپنی زندگی کو نہ صرف جسمانی لذتوں سے بلکہ روحانی سکون اور تکمیل سے ہم آہنگ کر سکے۔

ہَوَس ایک نفسیاتی و روحانی بدحالی کا نام ہے جو انسان کو ہر وقت اپنی حقیقت سے منحرف کر دیتی ہے اور اسے فانی دنیا کی جھوٹی لذتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ ایک شبہِ عارضی خوشی ہے جس کی شدت میں انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ زندگی کا اصل مقصد، سکون، محبت اور روحانی تکمیل ہے، نہ کہ محض جسمانی یا نفسیاتی خواہشات کی تسکین۔

شیفتگی، دل و دماغ کا اضطراب و اشتیاق

شیفتگی ایک ایسا پیچیدہ جذباتی اور نفسیاتی تجربہ ہے جو دل و دماغ کو یکساں طور پر بے قابو کر دیتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنے محبوب یا کسی خاص شے کے لیے اس قدر بے خود و مست ہوتا ہے کہ وہ اپنی عقل، احساسات اور قوتِ فیصلہ کو اپنی چاہت کی شدت میں تحلیل کر دیتا ہے۔ شیفتگی کی حالت میں انسان کا سارا وجود اس قدر محو و مگن ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیا، حقیقت اور تمام تر تقاضوں سے منحرف ہو جاتا ہے، اور صرف ایک شخص یا شے کے گرد اپنا سارا مرکزِ زندگی مرتب کر لیتا ہے۔

شیفتگی کی گہری نوعیت کا مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ دراصل ایک نہ ختم ہونے والی طلب کی صورت اختیار کرتی ہے، جو انسان کے دل میں ہمیشہ ایک خلش، ایک کھچاؤ، اور ایک بے قرار سی

کیفیت پیدا کرتی ہے۔ شیفتگی میں مبتلا شخص اپنے محبوب یا معشوق کے تمام اعمال و افعال کو ایسی شدت سے محسوس کرتا ہے جیسے وہ اس کی زندگی کا واحد مقصد بن چکا ہو۔ اس میں جسمانی و ذہنی طور پر یکسوئی کی حالت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ دل و دماغ کا ہر گوشہ صرف اور صرف محبوب کی موجودگی اور تصورات میں غرق ہوتا ہے۔

یہ کیفیت اکثر محبت یا تعلقات میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنے محبوب کو اس قدر اہمیت دے دیتا ہے کہ اس کی کوئی بھی حرکت، کوئی بھی نظر یا کوئی بھی گزرے لمحے کی یاد، اس کے دل کی دھڑکنوں میں تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو انسان کو اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتی ہے، اور وہ سچائی، اخلاق یا حقیقت کو ترک کر کے محض اس ایک شے کی تلاش میں جیتا ہے، جو اس کی دل کی گہرائیوں میں بستی ہے۔

شیفتگی کا آغاز انسان کے اندر ایک جذباتی خلا سے ہوتا ہے، جو اس کی تمام تر نفسیاتی و روحانی طلب کو متحرک کر دیتا ہے۔ یہ خلا دراصل انسان کی جستجو اور خواہشات کا عکس ہوتا ہے، جو اس کے دل میں کسی دوسرے شخص یا شے کے لیے ایک فطری اور جذباتی لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ اس میں کبھی کبھی یہ تاثر ہوتا ہے کہ محبوب سے تعلق میں انسان کا اپنا وجود ماند پڑ جاتا ہے، اور وہ اس کی محبت میں اتنا غرق ہوتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت، خودی اور تقدیر کا تعین بھی محبوب کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔

شیفتگی کی شدت میں مبتلا انسان کے لیے محبوب کی ہر بات، ہر چہرہ، ہر حرف ایک جادو کی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ محبوب کی یادوں میں غرق رہتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں اسے ایک کمی، ایک غم یا ایک دکھ کا سامنا ہوتا ہے، جو اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک نہ ختم ہونے والی خواہش اور طلب کی

صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کی زندگی کی تمام تر امیدیں، امنگیں اور ارمان ایک ہی شخص یا شے کے گرد گھومتے ہیں، اور وہ ہر حال میں اس سے جڑنا یا اس کی جانب قدم بڑھانا چاہتا ہے۔

یہ شوق اور لگاؤ ایک فطری نوعیت کا ہوتا ہے، جس کی شدت میں کسی قسم کی خود مختاری یا احتیاط کا گزر نہیں ہوتا۔ انسان اپنے آپ کو محبوب کی محبت میں یکجا کرنے کی کوشش میں خود کو اس کی گرفت میں دے دیتا ہے۔ شیفتگی کی اس حالت میں انسان اپنی ذہنی پختگی، فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور اپنی حقیقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا ہے، اور ایک خواب یا سراب کی طرح محبوب کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔

شیفتگی کے اثرات صرف جسمانی یا ذہنی سطح تک محدود نہیں رہتے، بلکہ یہ انسان کی روحانی و نفسیاتی حالت کو بھی گہرے اثرات سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس کیفیت میں بتلا شخص ایک طرح سے اپنے آپ کو مفقود یا تحلیل شدہ محسوس کرتا ہے، اور اسے ہر لحہ اپنی حقیقت، حیثیت اور خودی کی تلاش رہتی ہے۔ اس کی زندگی کی جڑیں محض محبوب یا معشوق کی موجودگی میں محسوس ہوتی ہیں، اور ان کی عدم موجودگی میں انسان ایک ان کہی کمی، ادھوری خواہش یا ایک بے سکونی کا سامنا کرتا ہے۔

شیفتگی کا اثر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں، ذہنی سکون اور روحانی زندگی پر بھی گہرا پڑتا ہے۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں بھی اس شدت کو محسوس کرتا ہے، اور اس کا ہر فعل یا ہر تحریک محبوب کی محبت سے متاثر ہو کر ایک نیئے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ایک مسلسل بے چینی اور اضطراب کا عنصر ہوتا ہے، جو اس کے قلب کو سرشار بھی کرتا ہے اور دل میں ایک نیئ توانائی پیدا کرتا ہے، مگر یہ توانائی ہمیشہ بکھری بکھری اور بے ترتیب ہوتی ہے۔

شیفتگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ فرد کو اپنی حقیقت سے ہٹا کر دوسروں کی نظر میں خود کو مکمل اور کامل بنانے کی کوشش میں لگاتا ہے۔ یہ کیفیت انسان کو اپنے آپ میں کھو کر دوسرے کے لیے خود کو

قربان کرنے کی ترغیب دیتی ہے، اور اس کی محبت میں اتنی شدت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عزت نفس، خودی، اور تقدیر کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اس کی محبت بن جاتی ہے، اور وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بسے اس جذبہ کو حقیقت بنانا چاہتا ہے۔

شیفتگی ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے، جس میں انسان اپنے دل و دماغ کو کامل سکون کے لیے ایک ہی سمت میں مائل کرتا ہے، مگر اس کا پورا ہونا یا مکمل سکون پانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلسل جستجو ہے، ایک خواہش ہے جو کبھی نہیں تھمتی، اور ایک گہری لگن ہے جو ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں بستی ہے۔

والہانہ پن، جنون کی سرحد پر ایک بے خودی کی کیفیت

والہانہ پن ایک ایسی شدتِ جذبات ہے جو انسان کو اپنی حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے، اور وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو جنون کی حد تک محبوب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جب انسان کی محبت یا کسی خاص شے کے لیے دیوانگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی شناخت، عزت نفس، اور حقیقت کو بھی پس پشت ڈال کر اپنی طلب کی تکمیل کے لیے ہر ممکن قدم اٹھاتا ہے۔ والہانہ پن کی حالت میں مبتلا شخص اس حد تک اپنے جذبات و احساسات میں غرق ہو جاتا ہے کہ وہ عقل و شعور کی تمام تر رکاوٹوں کو شکست دے دیتا ہے، اور صرف اپنے شوق کی تکمیل کو اولین مقصد قرار دیتا ہے۔

والہانہ پن دراصل ایک داخلی آتشِ شوق کا عکاس ہوتا ہے، جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں مسلسل جلتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں انسان کی ہر سوچ، ہر عمل، اور ہر لمحہ محبوب کی محبت یا اس کے گرد گھومتا ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا شخص کی دنیا محدود ہو جاتی ہے، اور اس کی تمام تر ذہنی و روحانی

توانائیاں اس ایک شے کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں جسے وہ دل و جان سے چاہتا ہے۔ یہ محبت کا وہ دریا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا، اور جس کی ہر لہر میں ایک نئی شدت، ایک نیا اضطراب، اور ایک نئی بے خودی پائی جاتی ہے۔

والہانہ پن میں انسان کے دل میں ایک ایسا خلش محسوس ہوتی ہے، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک مسلسل تشنگی ہے، ایک جستجو ہے جو کسی بھی صورت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کیفیت میں مبتلا شخص کا دل محض ایک طوفانی دریا کی مانند ہوتا ہے، جس میں محبت کی ہر لہر اسے تیز تر بہا لے جاتی ہے، اور وہ صرف ایک ہی مقصد کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے: محبوب تک پہنچنا، یا اس کی محبت کو حاصل کرنا۔ اس میں نہ کسی وقت کی اہمیت ہوتی ہے، نہ حالات کی، اور نہ ہی اس کے اپنے وجود کی۔ اس کے لیے صرف ایک چیز کی حقیقت ہے اور وہ ہے محبوب کی موجودگی، یا اس کی غیر موجودگی میں اس کی یاد کا تسلسل۔

والہانہ پن کی شدت میں انسان کی شخصیت کا ہر پہلو متغیر ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس کے اندر ایک ایسا عذاب پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قید میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے دنیا کی ہر خوشی، ہر سکون، اور ہر حقیقت بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس کی تمام تر ترجیحات اور نظریات اس ایک خواہش کے تابع ہو جاتے ہیں کہ وہ محبوب کے قریب ہو، یا اس کی موجودگی میں غرق ہو جائے۔ اس کا دماغ اور دل ہر حال میں اس کے وجود کے گرد گھومتے ہیں، اور وہ اس کی ہر حرکت، ہر نظر، ہر لمس کے پیچھے ایک جنونی نوعیت کی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے۔

والہانہ پن کی کیفیت دراصل ایک نہ ختم ہونے والی سفر کی طرح ہے، جس میں انسان کبھی نہیں رکتا، کبھی نہیں تھکتا۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں تمام تر معقولیت، عقل، اور وجدان کی حدود تحلیل ہو جاتی ہیں، اور صرف ایک جذبہ باقی رہتا ہے جو انسان کو ایک طوفان کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ اس میں کوئی بھی

رکاوٹ، کوئی بھی مخالفت، اور کوئی بھی حقیقت انسان کو اس کے راستے سے منحرف نہیں کر سکتی۔ اس کی محبت کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے، اور اس کی ساری توجہ صرف اسی کی طرف مرکوز رہتی ہے۔

والہانہ پن کی شدت میں انسان ایک بے خودی کی حالت میں ہوتا ہے جہاں وہ خود کو، اپنے جسم کو، اور اپنی عقل کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس میں نہ کوئی فاصلہ، نہ کوئی رکاوٹ، نہ کوئی مشکلات کا تصور ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو اپنی حقیقت سے بیگانہ کر دیتی ہے اور وہ ہر قیمت پر اپنے محبوب کی محبت کو حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جانے کی تیاری کرتا ہے۔

والہانہ پن کی کیفیت میں انسان کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اور اس کی محبت کی تلاش میں وہ ہر لحہ، ہر ساعت، اور ہر پل اپنی جان کو کسی نہ کسی خطرے میں ڈالتا رہتا ہے۔ یہ ایک طویل و پیچیدہ سفر ہے، جو انسان کو اپنی تقدیر، اپنی محبت، اور اپنی حقیقت کے تعلق میں شدید نوعیت کے اندرونی کشمکش سے گزرنے پر مجبور کرتا ہے۔

والہانہ پن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ انسان کی روح کو ایک نیئ جہت کی تلاش میں لے جاتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان اس قدر محو ہوتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو فقط اس کی محبت میں تلاش کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب وابستگی ہے جو انسان کو اپنی روحانی اور جذباتی تکمیل کے لیے اپنے محبوب سے بے حد مربوط کر دیتی ہے۔ والہانہ پن کی شدت میں بتلا شخص محبوب کے ساتھ ہر لحہ کی اشتہا میں بتلا رہتا ہے، اور اس کی خوشبو، اس کی آواز، اس کی ہر حرکت اس کے دل و دماغ میں ایک نیئ لذت پیدا کرتی ہے۔

اس کیفیت میں بتلا شخص کا ہر عمل، ہر نظر، اور ہر لفظ محبوب کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور وہ ہر لحہ اس کی موجودگی میں غرق رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو اس کی زندگی کے ہر پہلو کو مکمل طور پر تسخیر کر لیتا

ہے، اور وہ محبوب کی محبت میں ایک ایسی محویت محسوس کرتا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ بھی اس کے لیے اہم نہیں رہتا۔

جنون، عشق کی انتہائی شدت کا نام

جنون ایک ایسی نفسیاتی و روحانی کیفیت ہے جو انسان کو اپنی عقل و فہم سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں انسانی جذبات کی شدت اپنے منطقی حدود کو پار کر جاتی ہے اور دل کی دھڑکن میں خون کی تیز رفتاری کا ایک نیا طوفان برپا ہوتا ہے۔ جنون دراصل عشق کی انتہائی شدت اور محبت کے بے قابو جذبے کا نام ہے، جو کسی حد، کسی رکاوٹ، یا کسی اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنی عقل و ہوش سے بیگانہ ہو کر صرف ایک خواہش کے پیچھے دوڑتا ہے، اور وہ خواہش اسے ہر چیز سے بالاتر دکھائی دیتی ہے۔

جنون کی حالت میں مبتلا شخص، نہ کسی اصول کو مانتا ہے، نہ کسی روایتی قاعدے کو، اور نہ ہی اپنے ضمیر کی آواز کو۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو اپنے ہوش و حواس سے اس قدر بیگانہ کر دیتا ہے کہ وہ خود کو اور اپنی حقیقت کو مکمل طور پر فراموش کر دیتا ہے۔ جنون کے اس سمندر میں انسان کا دل، دماغ، اور جسم ایک ایسا طوفان بن جاتے ہیں جو اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں لیکن کسی راستے کو نہیں دیکھتے۔ اس کی ہر حرکت، ہر سوچ، ہر لفظ اس ایک مقصد کے حصول کے لیے ہے کہ وہ محبوب کی محبت میں غرق ہو جائے یا اس کی موجودگی کے قریب پہنچ جائے۔

جنون کے اندر ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے جو انسان کو ایک طرف سے بے پایاں محبت اور دوسری طرف سے مکمل تباہی کے کنارے تک لے جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنی

حیثیت، اپنی شناخت، اپنی کامیابیاں، اور اپنی ناکامیاں سب کچھ ترک کر دیتا ہے اور صرف اس جنونی خواہش کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی محبت کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بس اتنا چاہتا ہے کہ وہ اس جنون کی شدت میں مبتلا ہو کر اس کی تسکین حاصل کرے۔ جنون میں مبتلا انسان اس قدر بے خود ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے دنیا کی ہر حقیقت، ہر معقولیت، اور ہر معیار بے معنی ہو جاتے ہیں۔

جنون کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کو مکمل طور پر اپنی تقدیر کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اپنی قسمت کے فیصلہ کو سچ مان کر اس کی تکمیل کے لیے ہر خطرہ مول لیتا ہے۔ اس کی زندگی ایک غمگین اور درد بھری خواہش میں بدل جاتی ہے اور وہ ہر لمحہ اس فکر میں ڈوبا رہتا ہے کہ وہ کب اپنی محبت کو مکمل طور پر حاصل کرے گا۔ اس کیفیت میں انسان کے دل میں ہمیشہ یہ سوال گونجتا رہتا ہے کہ کیا یہ جنون کبھی ختم ہوگا؟ یا کیا یہ کبھی مکمل ہو پائے گا؟

جنون دراصل انسان کے دل کی ایک گہری خلا کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں محبت کی ایک ایسی غیر معقول شدت ہوتی ہے جو کسی بھی طرح سے مکمل نہیں ہو پاتی، اور ہر لمحے اس کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، وہ اسے کبھی بھی پورا نہیں کر پائے گا، اور یہ بے یقینی اور تشویش اس کے اندر ایک اور سطح کی ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔

جنون ایک ایسی تباہ کن محبت ہے جو انسان کو اپنی خودی سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس میں انسان اپنی مرضی اور خواہشات کو مکمل طور پر دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے اور اس کے بعد ہر لمحہ اس کی تقدیر ایک ہی فرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جنون کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو اپنی حقیقت سے آشنا

کرتا ہے، لیکن وہ حقیقت ایسی نہیں ہوتی جو خوشی یا سکون لے کر آتی ہو۔ اس میں بس تکلیف، اذیت، اور ایک مسلسل جستجو ہوتی ہے جو انسان کو مسلسل دوڑتی رہتی ہے۔

جنون کی شدت میں انسان ہمیشہ ایک عدم سکون کی کیفیت میں بتلا رہتا ہے۔ اس کے دل میں بس ایک ہی سوال ہوتا ہے: "کیا میں اپنے محبوب تک پہنچ سکوں گا؟" اور یہ سوال اس کے دماغ میں اس قدر گونجتا رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر پل کو اس کی تکمیل کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ جنون میں بتلا شخص کا ہر عمل، ہر سوچ، اور ہر قدم صرف اور صرف اس محبت کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا ہے جس کا کبھی اختتام نہیں آتا۔

جنون کی کیفیت میں انسان اپنی حقیقت سے بیگانہ ہو کر ایک دیوانے کی طرح اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اس محبت کے جذبے میں سرف کرتا ہے۔ اس کی محبت کی تڑپ اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے نقصان، تکلیف، یا رکاوٹ سے بے پرواہ ہو کر اس کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ جنون کی اس کیفیت میں انسان کو نہ اپنے جسم کی فکر ہوتی ہے، نہ اپنی روح کی، بلکہ وہ بس اس لمحے کو جیتنا چاہتا ہے جب وہ اپنی محبت کو مکمل طور پر حاصل کر لے گا۔

جنون کی حالت میں ایک عجیب سی دنیا آباد ہوتی ہے، جہاں صرف محبت کا رنگ ہوتا ہے اور باقی ہر شے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت میں انسان کا دل، دماغ، اور جسم ایک ہی مقصد کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں: وہ مکمل طور پر اپنے محبوب کی محبت میں غرق ہو جانا چاہتا ہے، اور یہ خواہش اسے ہر حد تک لے جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی شناخت، عزت نفس، اور تمام حدود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جنون کا یہ جذبہ ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جو انسان کی زندگی کو تسخیر کر لیتی ہے، اور وہ اس کی شدت میں بتلا ہو کر اپنی حقیقت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

یہ جنون ہی ہے جو انسان کو اپنے مقصد سے جوڑتا ہے، اپنی حقیقت سے بیگانہ کرتا ہے، اور اس کی دنیا کو ایک نئے طور پر تشکیل دیتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو انسان کو اس کی تقدیر کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے، اور اس میں کوئی بھی رکاوٹ یا پیچیدگی اسے روک نہیں سکتی۔ جنون کی شدت میں مبتلا انسان صرف ایک چیز کی خواہش کرتا ہے: اپنی محبت کو مکمل طور پر حاصل کرنا، اور اس کے لیے وہ اپنی تمام تر دنیا کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

فنا، وجود کی اس حد تک مکمل تباہی

فنا ایک ایسا لفظ ہے جو انسان کی وجودی حقیقت اور اس کے اندر موجود ہر احساس کی مکمل اور حتمی تباہی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ لفظ دراصل انسان کے تمام حواس، جذبات، اور خواہشات کے برباد ہونے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، جب وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ کسی اور کی محبت، چاہت یا حقیقت میں ضم ہو سکے۔ فنا کی حالت میں انسان اپنی خودی، اپنی انفرادیت، اور اپنی فردیت کو فنا کر دیتا ہے تاکہ وہ کسی اعلیٰ حقیقت میں ضم ہو جائے، یہ حقیقت وہی ہے جسے بعض اوقات حقیقی عشق یا خدا کی محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فنا کی حقیقت میں داخل ہونے کے لیے انسان کو اپنی ذات کی سرکشی کو ختم کرنا پڑتا ہے اور اپنی مکمل حقیقت سے بیگانہ ہو کر ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، جہاں وہ کسی بھی قسم کی فردیت یا شناخت کو ترک کر دے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں انسان اپنی دنیا کو اس قدر مٹانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا وجود محض ایک خیال یا ایک دھندلی سی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ فنا میں انسان خود کو اس قدر معدوم کر دیتا ہے کہ وہ خودی کی تمام حدود سے آزاد ہو جاتا ہے اور اپنی اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

فنا کی کیفیت ایک ایسی مسافر کی مانند ہوتی ہے جو اپنے راستے کے تمام نشانوں کو مٹا کر صرف ایک خالی اور بے نشان راستے پر چلتا ہے۔ اس راستے پر نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی مقصود، صرف ایک مسلسل گمشدگی اور ناپیدگی کی کیفیت ہوتی ہے۔ فنا کا یہ سفر، دراصل انسان کو اس کے داخلی حقیقت سے جوڑنے کا ایک ذریعہ بنتا ہے، جہاں وہ اپنی تمام تر فانی خواہشات کو ترک کر کے اپنے روحانی مقصد کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کا دل ہر ایک دھڑکن کو مٹا دیتا ہے اور ہر جذبے کو فنا کر کے فقط اپنے رب کی رضا اور محبت کی تکمیل میں غرق ہو جاتا ہے۔

فنا کا یہ عمل خودی کے موت کی مانند ہوتا ہے، جہاں انسان خود کو اس وقت تک فنا کرنے کی کوشش کرتا ہے جب تک کہ اس کا وجود خودی کی تمام پرتوں سے پاک نہ ہو جائے۔ فنا کے اس عمل میں انسان کا ہر لمحہ اپنے آپ کو اسقدر مٹا دینے کی تگ و دو کرتا ہے کہ وہ اس کی زندگی کا مقصد اور اصول صرف ایک ہی حقیقت میں سمٹ جاتا ہے: "یعنی میں ہوں ہی نہیں، میری حقیقت ایک دھندلی تصویر ہے جو ایک عالمگیر حقیقت میں گم ہو گئی ہے۔" فنا کی اس کیفیت میں، انسان کی حقیقت محض ایک خلا بن جاتی ہے، اور وہ خلا جس میں ہر چیز معدوم ہو چکی ہو، سچائی اور محبت کی مکمل روشنی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

فنا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو اس کی موجودگی سے باہر نکال کر اس کی حقیقت میں غرق کر دیتی ہے۔ فنا کی حقیقت میں انسان کا دل، دماغ، اور روح ایک مشترکہ عمل میں متحرک ہوتے ہیں، جہاں ان سب کی حرکات اور جذبات کا مقصد صرف اور صرف اپنی موجودگی کو مٹانے اور حقیقت میں ضم ہونے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی ہر سانس، ہر قدم، ہر نظر، اور ہر سوچ ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو اسے اس کی خودی سے ہٹا کر اس کی تقدیر کی حقیقت میں غرق کرتا ہے۔

فنا کی یہ کیفیت انسان کو اپنے ذاتی غرور، تکبر، اور انا نیت سے بالاتر کر دیتی ہے اور اسے ایک ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں اس کی تمام تر خواہشات، ارمان، اور تمنائیں فنا ہو جاتی ہیں اور وہ فقط اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی رضا میں ضم ہو جائے۔ فنا کی کیفیت میں انسان اپنے تمام تر تعلقات، آرزوؤں اور شکوک و شبہات کو ترک کر کے صرف اور صرف اپنے وجود کی اس فنا کی تلاش میں ہوتا ہے، جو اسے خدا کی قربت میں پہنچا دے۔

فنا کی اس حالت میں انسان کی روح مکمل طور پر ایک نیا روپ اختیار کرتی ہے۔ یہ ایک داخلی بیداری کی کیفیت ہوتی ہے. جس میں انسان اپنے آپ کو اس کائنات کے وسیع اور لامحدود سمندر میں ایک قطرہ محسوس کرتا ہے۔ فنا کی کیفیت میں ہر چیز، ہر آواز، ہر منظر، اور ہر احساس ایک نیا مفہوم اختیار کرتا ہے۔ اس کی تمام تر حقیقتیں اس کے سامنے ایک دھندلے منظر کی مانند بے حقیقت نظر آتی ہیں اور اس کا دل صرف اس واحد حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے، جو اس کی ذات سے ماوراء ہے۔

فنا میں انسان کا دل، دماغ، اور روح اس قدر ایک مکمل اتحاد میں آ جاتے ہیں کہ ان کی کوئی انفرادی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ یہ کیفیت انسان کو اس کے وجود کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر مٹا دیتا ہے اور صرف وہی حقیقت باقی رہ جاتی ہے جو اس کے اندر حقیقت کے سرچشمے کی طرح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ فنا کی یہ کیفیت انسان کو اپنی ذات سے اتنا جدا کر دیتی ہے کہ وہ اس کو اس دنیا کے عارضی اور فانی تمام رشتہ و تعلقات سے بے گلہ کر کے فقط اپنی روحانی حقیقت کی جستجو میں غرق ہو جاتا ہے۔

فنا کا عمل دراصل انسان کی روح کے ارتقاء کا ایک زبردست ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں انسان اپنے جسمانی اور مادی دنیا کے تمام حدود سے آزاد ہو کر ایک ایسی روحانی حقیقت کی طرف بڑھتا ہے. جس میں وہ خود کو

اپنے خالق کی حقیقت میں مگن پاتا ہے۔ فنا کی اس حالت میں، انسان ہر شے کو مٹی کی طرح سمجھ کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور صرف ایک ہی حقیقت کے پیچھے بھاگتا ہے، اور وہ حقیقت ہے اس کی روح کی تکمیل۔

فنا میں انسان کا ہر عمل، ہر جذبہ، اور ہر فکری عمل صرف ایک مقصد کے لیے ہوتا ہے: اس کی روح کا پاکیزہ ہونا، اس کا خودی سے آزاد ہونا، اور اس کی حقیقت کا اس کے خالق کے ساتھ ہم آہنگ ہونا۔ یہ ایک مکمل انقطاع کی کیفیت ہوتی ہے، جس میں انسان ہر چیز سے مکمل طور پر جدا ہو کر فقط اس حقیقت کے سائے میں ضم ہو جاتا ہے جو اس کی حقیقت کی جڑ ہے۔

وصل، ایک روحانی تکمیل اور اتحاد کی حالت

وصل ایک ایسی روحانی، عاطفی، اور فکری کیفیت ہے جو انسان کو اپنی اعلیٰ حقیقت اور مطلوبہ معشوق کے ساتھ مکمل طور پر جوڑ دیتی ہے۔ یہ حالت انسان کی داخلی ضرورت اور خارجی خواہشات کے عین مرکز میں واقع ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے عشق کی تمام مراحل کو طے کر کے، ایک ایسی وحدت میں ضم ہو جاتا ہے جسے "وصل" کہا جاتا ہے۔ وصل کی اس کیفیت میں انسان اپنی فردیت کو مٹانے کے بعد اس طرح اتحاد کی لذت محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی بیرونی حقیقت سے تعلق کا قائل ہو کر اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے۔

وصل کی حالت ایک ایسے گہرے اور لطیف رشتہ کی عکاسی کرتی ہے جو فرد اور اس کے معشوق کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ یہ معشوق چاہے کسی روحانی ذات کی صورت میں ہو، یا پھر کسی انسان کی صورت میں، وصل کی حقیقت میں اس کا ہر عمل اور ہر جذبہ ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ وصل کے اس عالم میں فرد اپنی ذاتی خواہشات، اہداف، اور آرزوؤں سے بلند ہو کر اپنی حقیقت کو اس کے معشوق میں ضم

کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کیفیت میں فرد کا وجود اپنے معشوق کی قربت میں غرق ہو کر مکمل ہو جاتا ہے۔

وصل کی حالت میں، انسان اپنے وجود کی ہر پرت کو اس حقیقت کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت کبھی کسی محبوب کی صورت میں، کبھی اللہ کی قربت میں، اور کبھی کسی روحانی تجربے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وصل ایک ایسا لمحہ ہے جب انسان اپنے تمام فانی خیالات، احساسات، اور خواہشات کو ایک طرف رکھ کر، صرف اور صرف اپنی روح کی تسکین کی جستجو میں اس حقیقت کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے جو اس کے دل میں محفوظ ہے۔

وصل کا یہ عمل ایک گہرے اور روحانی انصہام کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں انسان کی روح، دل، اور دماغ ایک روحانی اتحاد میں ڈوب جاتے ہیں، جہاں فرد کی ہر حرکت، ہر نظر، اور ہر خیال میں اس کے معشوق کی موجودگی کا عکس صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں انسان کی فکر اور عمل ایک دوسرے میں مل کر ایک روحانی سفر کا آغاز کرتے ہیں جس کا کوئی انتہاء نہیں ہوتی۔ وصل کی کیفیت میں انسان ہر لمحہ اپنے معشوق کے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور اس کی تمام تر شناخت کو مٹا کر، صرف معشوق کی شناخت میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

وصل کی یہ حالت انسان کی حقیقت کا عروج ہوتی ہے، جہاں وہ اپنی مکمل حقیقت کو اس کے معشوق میں ضم کر لیتا ہے۔ وصل میں انسان اپنی ہر تمنا، ہر آرزو، اور ہر خواہش کو معشوق کے لیے قربان کرتا ہے اور اس کے ساتھ ایک مکمل طور پر یکجا ہو جاتا ہے۔ اس میں انسان کی شخصیت، اس کے جذبات، اس کے خیالات، اور اس کے اعمال تمام کی تمام معشوق کی حقیقت میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ کیفیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک فرد اپنی ذات کی آخری حدوں تک پہنچ کر اپنی انفرادیت کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ وصل میں انسان اپنی تمام فانی شخصیت کو ترک کر دیتا ہے اور اپنے معشوق کے ساتھ ایک نئی حقیقت کا آغاز کرتا ہے، جو ابدی اور غیر فانی ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں فرد اپنے روحانی مقصد کی تکمیل کی جانب بڑھتا ہے اور اپنے معشوق کی قربت میں اس کی حقیقت کو شناخت کرتا ہے۔

وصل کی حالت میں انسان کی ہر حرکت اور ہر عمل میں ایک خاص روحانی لذت اور سکون ہوتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں فرد اپنے معشوق کے قریب تر آ کر اس کی موجودگی کو مکمل طور پر محسوس کرتا ہے۔ اس میں انسان کا دل، دماغ، اور روح ایک ہم آہنگی میں ڈوب جاتے ہیں، جہاں وہ ہر چیز کو اپنے معشوق کی موجودگی سے ہی پرکھتا ہے۔ وصل کا عمل اس کے لیے ایک مسلسل جستجو بن جاتا ہے، جس میں وہ ہر لمحہ اپنی حقیقت کو معشوق کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

وصل کی حقیقت ایک ایسی وحدت ہوتی ہے جس میں فرد اپنی تمام تر خواہشات، آرزوئں، اور توقعات کو معشوق کے قدموں میں گرا دیتا ہے۔ اس میں انسان کا دل اپنے معشوق کی محبت میں ڈوب جاتا ہے اور وہ اپنی حقیقت کو اس کی محبت میں محو کر دیتا ہے۔ وصل کی اس کیفیت میں انسان ہر طرف سے بے نیاز ہو کر، صرف اور صرف اپنے معشوق کی محبت اور قربت کی طلب میں جیتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان اپنی روحانی ضرورتوں کو سمجھتا ہے اور اپنی تمام تر فانی حقیقتوں کو معشوق کی قربت کے لیے قربان کر دیتا ہے۔

وصل کا یہ عمل دراصل انسان کی روح کے ارتقاء کا ایک سنگ میل ہوتا ہے۔ اس میں انسان اپنے جسمانی اور مادی دنیا کے تمام حدود سے آزاد ہو کر ایک ایسی روحانی حقیقت کی طرف بڑھتا ہے جس میں وہ

اپنے معشوق کے ساتھ مکمل طور پر یکجا ہو جاتا ہے۔ وصل کی حالت میں انسان اپنے تمام فانی خیالات اور جذبات کو ترک کر کے صرف اور صرف معشوق کی حقیقت میں گم ہو جاتا ہے۔

وصل کی اس کیفیت میں انسان کی حقیقت محض معشوق کی قربت میں سمو جاتی ہے۔ اس میں انسان کا ہر عمل اور ہر خیال معشوق کے لیے وقف ہو جاتا ہے اور وہ اپنی حقیقت کو معشوق کے سائے میں مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وصل کی کیفیت میں انسان کے ہر لمحے کی مٹھاس اور سکون معشوق کی قربت میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے، اور وہ اس کی محبت میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کی حقیقت اور وجود کا مفہوم محض معشوق کی محبت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

فکرو تدبر پہ مبنی شاعری، نظمیں، غزلیں

یہ صفحات ایک ایسے فکری و روحانی جہان کی تجلیات ہیں جہاں تدبر کی روشنی، دین کی حکمت، فلکیات کے اسرار، عشق کی گہرائیاں اور محبت کی نزاکتیں یکجا ہو کر ایک منفرد رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہاں عقل و وجدان کی سرحدیں ملتی ہیں، جہاں خرد و جنون کی کشمکش نئے معانی دریافت کرتی ہے، اور جہاں فکر کی پہنائیوں میں گم ہونے والے راہِ یقین کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہاں دینیات کی ژرف بینی میں حقیقت کے پرت کھلتے ہیں، فلکیات کے آفاق میں کائنات کے سربستہ راز سرگوشیاں کرتے ہیں، اور عشق و محبت کی نیرنگیاں انسانی جذبات کی لطافت و شدت کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں کہیں صوفیانہ وارفتگی ہے تو کہیں فلسفیانہ گہرائی، کہیں عاشقِ ازل کی بے قراری ہے تو کہیں عاقل کی متانت۔ ہر شعر ایک جہانِ معانی سموئے ہے، ہر لفظ ایک کائنات کا در وا کرتا ہے۔

یہاں الفاظ محض زینت نہیں بلکہ فکر کے دریچے کھولنے والے چراغ ہیں۔ یہ تحریریں ایک ایسی روحانی و علمی جستجو کی مظہر ہیں جو عقل کو جِلا بخشتی ہیں، قلب کو مہمیز دیتی ہیں اور روح کو ایک نئے شعور کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں، وہ تخلیقی منظر نامہ جہاں فکرو تدبر، دین و معرفت، فلکیاتی حیرتیں، عشق کی بے خودی اور محبت کے لطیف جذبات یکجا ہو کر ایک دانشمندانہ مگر جذباتی ہم آہنگی میں ڈھل جاتے ہیں۔

بحرِ معانی میں غواصی

ذاتِ واجب الوجود، محیطِ کلیات و جزئیات، منبع تجلیات و مبدأ موجودات، وہ ذاتِ سرمدی جو لایزال، لامحدود، لامتناہی اور لازوال ہے۔ عقلِ انسانی جس کی حقیقتِ مطلقہ کے احاطے سے عاجز، شعورِ ناقص جس کی کنہِ حقیقت کے درک سے قاصر، اور فہمِ فانی جس کی ماہیتِ خالصہ کے ادراک سے محروم ہے۔

وہ قدیم الذات ہے، زمان و مکان کی قیود سے ماورا، ہر ابتدا سے پیشتر اور ہر انتہا کے بعد بھی باقی۔ اُس کی ازلیت، دوام کی مظہر اور اُس کا بقاء، سرمدیت کا آیئنہ ہے۔ وہ حادث نہیں کہ حدوث اس کے لیے محال ہے، اور نہ فانی کہ فنا اس کی شان سے بعید ہے۔

احد، صمد، واحد، بے نیاز، بے مثل و بے مثال، وہ اپنی ذات میں منفرد، صفات میں یکتا اور افعال میں بے ثانی ہے۔ نہ کوئی اُس کی جنس ہے، نہ اس کا ہم سر، نہ کوئی نظیر، نہ کوئی شریک۔ اُس کی توحید، عقلِ انسانی کے ہر وہم و گمان سے بالاتر ہے اور اُس کی احدیت، تصور کے ہر دایئرے سے باہر ہے۔

وہ قادرِ مطلق، محیطِ تام، اور مختارِ کل ہے۔ اُس کی قدرت لامتناہی، اُس کی مشیّت غیر متغیّر، اور اُس کی حکمت، رازہائے پنہاں کا محور۔ وہ ماہیٔ امکان کو عرصۂ شہود میں لانے والا، نیستی کو ہست میں بدلنے والا، اور معدومات کو عالمِ وجود میں داخل کرنے والا ہے۔

وہ علیمٌ بذاتِ الصدور، محیطٌ بالسماوات والارض، عالم الغیب والشهادہ، اُس کا علم غیر متناہی، اُس کی معرفت غیر محدود۔ ہر ذرۂ کائنات میں اُس کی خبر، ہر نقشِ ہستی میں اُس کی معرفت، ہر لحظۂ وجود میں اُس کی نگاہ۔ اُس کا علم مسبوق بہ جہل نہیں، اور نہ محدود بہ کسی علت۔

وہ حیّ و قیّوم، زندہ و پایئندہ، نہ اسے نیند لاحق، نہ اونگھ مسلط۔ اُس کی حیات ازلی، اُس کا بقاء سرمدی، وہ مبدائے حیات بھی اور منتہائے وجود بھی۔ کوئی شے اُس کی زندگی میں تغیر نہیں لا سکتی، نہ کوئی حادثہ اُس کی بقاء میں خلل ڈال سکتا ہے۔

وہ حکیمٌ بالذات، عادلٌ بالکمال، اُس کی تدبیر میں حکمت، اُس کے فیصلے میں عدل۔ کائنات کے تمام نظامات اُسی کے میزانِ حکمت میں مربوط، کُل حوادثاتِ عالم اُسی کے محض عدل کے تابع۔ اُس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں، اور نہ کوئی تقدیر انصاف سے عاری۔

وہ فعالٌ لما یرید، اُس کا امر نافذ، اُس کی مشیّت غیر متبدل۔ ہر امر اسی کے حکم سے وقوع پذیر، ہر مقدر اُسی کی مرضی کے تابع، اور ہر نقشِ تقدیر اُسی کے قلم سے رقم شدہ۔

وہ غفّار الذنوب، ستّار العیوب، واسع المغفرہ، رحمٰن ورحیم۔ اُس کی رحمت وسیع تر، اُس کی مغفرت لامحدود، اور اُس کا کرم بے پایاں۔ وہ خطاؤں کو معاف کرنے والا، لغزشوں کو درگزر فرمانے والا، ندامت کے آنسوؤں کو قبول کرنے والا۔

وہ جمیلٌ بذاتہ، جلیلٌ بصفاتہ، اُس کی ذات میں حسن کی جلوہ آرائی، اُس کی صفات میں جلال کی ہیبت۔ اُس کی تجلی سے ذراتِ عالم منور، اُس کی ہیبت سے اہلِ سماوات لرزاں۔

وہ رزّاق، وہّاب، ذوالفضل العظیم۔ ہر جاندار کا رزق اُسی کے دستِ کرم سے وابستہ، ہر محتاج کی حاجت اُسی کے دربار سے روا۔ وہ بغیر کسی سبب کے عطا کرنے والا، بغیر کسی علّت کے نعمتیں بانٹنے والا۔

وہ سمیعٌ بلا اُذن، بصیرٌ بلا عین، اُس کی سماعت، ہر صدا سے ماورا، اُس کی بصارت، ہر نگاہ سے بالاتر۔ وہ صدا کو بغیر کان کے سنتا، اور نور کو بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے۔

وہ متکلمٌ بذاتہ، اُس کی کلام، غیر مخلوق، اُس کا بیان، ازلی وابدی۔ اُس کی وحی میں حکمت، اُس کے فرمان میں تدبیر، اور اُس کے خطاب میں تاثیر۔

وہ محیطٌ بکل شیء، اُس کے علم کا دائرہ ہر چیز پر وسیع، اُس کی نگاہ ہر ذرہ پر محیط، اُس کی قدرت ہر شے پر حاوی۔ وہ قیّوم، کہ کوئی شے اُس کے بغیر قائم نہیں، اور کوئی وجود اُس کے فیض کے بغیر باقی نہیں۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے اوصاف و کمالات کا احاطہ، عقلِ انسانی کے لیے ناممکن، فہمِ بشری کے لیے محال۔ وہ جسے چاہے معرفت عطا کرے، جسے چاہے اپنے انوارِ الوہیت سے منور کرے۔ ہر زبان اُس کے ذکر میں قاصر، ہر قلم اُس کی مدح میں ناتواں، اور ہر عقل اُس کی حقیقت کے فہم سے عاجز۔

وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا "(ہمارے رب کا علم ہر شے پر محیط ہے)"

ذاتِ حق

ہر اِک ذرّے میں تیرا نور پایا

جہاں دیکھا، تجھے مسطور پایا

خلا کی وسعتوں میں گونجتی ہے

صدا جس نے ازل میں دور پایا

عدم کی تیرگی میں تھا کہاں میں؟

تجھے دیکھا تو خود شعور پایا

یہ خاکی جسم فانی ہے مگر میں

تری رحمت میں اک معمور پایا

نظر آتا نہیں لیکن حقیقت

ہر اِک شے میں ترا ظہور پایا

مجھے حیرت نے سجدے میں جھکایا

کہ جب تیرا کرم بے حُدود پایا

منوّرِ کعبہ و نورِ مدینۂ نبی

خاکِ درِ نبی پہ جھکائے ہوئے کھڑے
اشکوں میں ڈوب کر بھی مسکرائے ہوئے کھڑے

دیوارِ غم سے دور، قُربت کی روشنی
روضے کے در پہ سر کو جھکائے ہوئے کھڑے

خوشبوئے مُشک و عَنبر میں لپٹی ہوئی ہوا
سرکار کے دیار میں آئے ہوئے کھڑے

اَسود کی روشنی تھی جو دل میں اتر گئی
کعبے کے سامنے بھی سمٹائے ہوئے کھڑے

لب پر درود، آنکھ میں اشکوں کے کہکشاں
دستِ دعا میں شوق جگائے ہوئے کھڑے

طیبہ کی خاک چھو کے جو آتے ہیں بار بار
پھر زندگی کے راز چھپائے ہوئے کھڑے
کعبے کی روشنی ہو کہ روضے کی وہ بہار
دل میں عجب سرور بسائے ہوئے کھڑے

طُورِ حُسنِ مُصطفیٰ ﷺ

مہ و مہر شرمائیے، وہ نورِ مجسّم،
جمالِ دو عالم، وقارِ مکرّم

لغاتِ ازل میں فصاحت کا دریا،
بشارت کی خوشبو، سخاوت کا شبنم

جبینوں پہ تحریر تھا اسمِ سرور،
قِرطاسِ ہستی پہ مہرِ مُعظّم

سہانی گھڑی میں ضیا در ضیا تھا،
فلک جھک گیا تھا، زمیں تھی مُبَسَّم

کہاں سدرہ و عرش، کہاں رفعتیں تھیں،
کہاں اوج کی حد، کہاں پیکرِ اعظم

ہوا خَلق میں ذکر ایسا مہکتا،
کہ ہر سُو معطّر ہوا نطقِ انجم

مَلَک سر بہ زانو، جبینیں جھکی تھیں،
زباں پر درود و سلامِ مُسلّم

نوحہ، ماتمِ ہستی

تھے کہیں ہم، جو گم ہو گئے ہیں
دیکھتے ہیں، تو ہم ہی رو گئے ہیں

تلاشِ حقیقت تھی، نہیں مل سکی
بے بسی میں دل چھوٹا ہو گیا ہے

یہ جو اک خلا ہے، دل میں بسا ہے
کیا وہ روشنی کہیں چھپتی جا رہی ہے؟

سایۂ قدرت کی ہر امید ٹوٹ گئی
اب ہم خود میں بھی غیر ہو گئے ہیں

نہ شوقِ زیست باقی ہے نہ کوئی آس
ماتمِ ہستی ہے، دل میں بس فریاد

جوابِ نوحہ، پیامِ حقیقت

تھے تم، مگر ابھی تم ہی ہو یہاں
تمہاری ہستی، ہر سو جاگ رہی ہے

جو تلاش کرتے ہو، وہ تمہاری روح ہے
یہ سکونِ دل بھی تمہارے در پر ہے

وہ جو خلا ہے، تمہاری جستجو ہے
تمہاری طلب کا ایک راز کھلا ہے

ہر اندھیرا، حقیقت کی روشنی ہے
تمہارا درد بھی تو وہی خوشی ہے

تم نہ غیر ہو، تمہاری حقیقت میں
اللہ کا عکس ہے، تمہاری جستجو میں

دعائے حِکمت، (بچوں کے لئے)

اے خدا! صبح کی کرنوں سا اجالا دے دے،
میرے افکار کو روشن کوئی رستہ دے دے

میرے ہونٹوں پہ سچائی کی زباں جاری ہو،
میری ہر بات میں خوشبوئے وفا شامل ہو

حوصلہ ایسا عطا کر کہ جھکوں نہ ہرگز،
جس طرف جاؤں، میں لے جاؤں صدا حق یارب

میرا کردار ہو تفسیرِ مورخہ کی طرح،
میری پہچان ہو اعمال کی روشن شمع

دے مجھے صبر، جو زخموں کو دے مسکاں یارب،
دے یقین ایسا جو پتھر کو بھی دریا کر دے

میرے ہاتھوں کسی کمزور کو طاقت دے دے،
میرے لفظوں میں ہر انسان کو ہمت دے دے

میں بنوں ایسا ستارہ کہ مٹا دوں ظلمت
روشنی بن کے میں دنیا میں اجالا کر دوں!

رموزِ لامکاں

بہت اسرار پنہاں ہیں، نہاں تا بیکراں کے بعد
نہاں کیا ہے؟ کسے معلوم، فہم ناگہاں کے بعد

سماوی جادۂ کہنہ میں کیا گُم ہے، کیا ظاہر؟
ہے لب بستہ فلک ہر بار، عقدۂ کُہن کے بعد

سوادِ بیکرانی میں عمیق ابحار کی صورت
کہاں لے جائے گی گردش ہمیں طوفان زَن کے بعد؟

سوادِ ثقبِ مظلم میں ہے کون ولامکانی؟
ازل سے تا ابد پھیلی ہیں راہیں بے نشاں کے بعد

نہ شمس وماہ کا ہے معلوم، رازِ فروغِ نور
نہ تاروں کی زباں کھُلتی ہے ذکرِ کہکشاں کے بعد

کہاں ہے طور کی تجلی، برقِ ناری کا سراغ؟
کہاں ہے نورِ طارق، روشنی کن کہکشاں کے بعد؟

یہ طبع کائناتی کس جوازِ جُستجو میں ہے؟
مسافت در مسافت ہے سفر کی داستاں کے بعد

ازل سے ذہنِ آدم غور میں محوِ تجسس ہے
مگر ہر عقدہ مشکل ہے کسی حل کے گماں کے بعد

ندیمؔ، افلاک کی پہنائیاں حیران کرتی ہیں
یہ حیرانی نہ جائے گی قیامت کی اذاں کے بعد

فکرِ لامحدود

بکھرتی سوچ کے کہسار میں تدبر تھا
نجوم و مہر کی گردش میں بھی تفکر تھا

ہویدا رازِ فلک جب ہوئے خرد پر وا
تو ہر شعاع میں تجلی کا ایک منظر تھا

یہ کہکشاں کی ہے وسعت، یا ہے پروازِ ذہن؟
ہر ایک موڑ پہ حیرت کا ایک لشکر تھا

شعاعِ نور کی رفتار بھی ہوئی محدود
سیاہ شگاف جہاں وقت کا بھی محشر تھا

زمانی سرنگ، زمانے کی سرحدیں یا راز؟
ہر ایک خم میں تخیل کا ہی سمندر تھا

ستارگان کے مد و جزر چھپے اسرار
نہاں کواکب و سیار میں تدبر تھا

سوالِ عقل نے جب کی فضا میں اک پرواز
تو ہر مقام پہ تخلیق کا ہی جوہر تھا

ندیمؔ، گردشِ افلاک سے نہ تھا غافل
یہ کائنات بھی گویا کسی کا دفتر تھا

چپ سہنی پڑی

شبِ ہجراں کی تپش سہنی پڑی ہے
چراغِ دل کی لو بھی رکھنی پڑی ہے

جو تیری بزم میں جا کر بھی نہ بکھری
ہمیں وہ خاک بھی چکھنی پڑی ہے

نہ یوسف ہم، نہ کوئی قافلہ ہے
مگر پھر بھی گلی، بکنی پڑی ہے

ستم گر! تجھ سے شکوہ کیا کریں ہم؟
ہمارے لب پہ چپ رکھنی پڑی ہے

ہماری داستاں سننے سے پہلے
زمانے کو بھی چُپ سَہنی پڑی ہے

یہ کیسا دور آیا ہے کہ ہم کو
وفا بھی سوچ کر کرنی پڑی ہے

جو باقی تھا وہ خوابوں میں لٹا ہے
جو گزری ہے، وہ اب لکھنی پڑی ہے

وسعتِ افلاک

یہ کس کی روشنی بہتی رہی ہے؟
کہ تاریکی سمٹتی جا رہی ہے

نجوم و کہکشاں حیراں کھڑے ہیں
یہ کس کی سمت دنیا جا رہی ہے؟

رہی صدیوں سے خاموشی مسلط
مگر اب کائنات گا رہی ہے

فلک پر راہ کس نے کر دی روشن؟
ہوا کس کی نظر، بہتی رہی ہے؟

یہ بزمِ کہکشاں، رقصاں ہے کیوں کر؟
یہ موجِ نور کیا کہتی رہی ہے؟

خلا کی گونج میں پیغام کس کا؟
صدا کس کے لیے آتی رہی ہے؟

حقیقتِ انسان

یہ کس مٹی سے ہم کو گوندھا ہے؟
کہ ہر ذرہ ہمارا آئینہ ہے

نہ ہم خاکی، نہ ہم نوری صنم ہیں
ہمارا راز سب سے برملا ہے

ہماری سوچ حد میں قید کیوں ہو؟
ہماری وسعتوں کا کیا خلا ہے؟

یہی تقدیر ہے یا امتحاں ہے؟
کہ ہر سانسوں میں اک نیا گلا ہے

کبھی سایہ، کبھی سایا نہیں ہم
وجودِ آدمی بھی ماجرا ہے

زمیں سے آسماں تک جا رہے ہیں
یہ پروازِ خرد کا سلسلہ ہے

حقیقت یا سراب؟

عشق کی راہ میں جلنا پڑا ہے
خاک ہونا بھی عملنا پڑا ہے

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں رہ کر
حرفِ ہجراں بھی لکھنا پڑا ہے

اک طرف آتشِ ہستی کا دریا
اک طرف ڈوب کے جینا پڑا ہے

عشق دنیا میں سرابوں کی صورت
عشقِ حق میں تو سمٹنا پڑا ہے

دہر کی آنکھ نے دیکھا ہمیں یوں
کبھی بکھرے، کبھی جُڑنا پڑا ہے

تجھ تلک آ کے یہ سمجھا ہوں آخر
راستہ خود میں ہی ڈھونڈنا پڑا ہے

سوزِ ناتمام

زیست اک سرابِ فانی، وہم بے بنیاد تھی
ہر تمنا خاک میں لپٹی ہوئی فریاد تھی

دید کی تابانیوں میں جلوۂ ہجراں ملا
ہر نظر آشفتہ تھی، اور موج بے بنیاد تھی

عشق تھا یا واہمہ، یا کوئی سودائے فکر؟
زندگی اک تند خو طوفان کی ایجاد تھی

وقت کی بے رحم موجوں میں بہے افکار سب
دانش و حکمت کی ہر تحریر بے امداد تھی

موت ہر دم سایہ فگن، راہگزر کے سنگ سنگ
ہر گھڑی دل پر نزولِ آہِ نا افتاد تھی

حرفِ حق لکھنے کی جرأت تھی مرا سرمایۂ زیست
ہر صدا صد چاک تھی، ہر بات استفساد تھی

دہر کی دہلیز پر میں تھا کہ میرا خواب تھا؟
فکرِ دنیا کج روش تھی، سوچ بے بنیاد تھی

میں نے ہر سائے میں دیکھا عکسِ نامعلوم کو
ہر حقیقت در حقیقت پردۂ بیداد تھی

کب اجل دستک آئے، نفس کب رک جائے گی؟
زندگی بھی راز تھی، ہر سانس نا افتاد تھی

حزنِ جاوداں

یہ کیسی تھی محبت، یہ کیسا تھا فسانہ؟
کبھی خوابوں کا جگنو، کبھی اشکوں کا خزانہ

کہا دل کی حقیقت، وہ پہلے تو مکر گئی
مگر پھر مان بھی گئی، ہوا دل کا ٹھکانہ

بڑھی چاہت کی شدت، ہوئے جذبات روشن
مگر قسمت کے ہاتھوں، ہوا پھر سے بہانہ

گئے رشتے کی خاطر جو ہم اہلِ وفا تک
نہ اپنے مانتے تھے، نہ دنیا نے زمانہ

وہ جس کے نام پر تھی یہ دنیا میرے دل کی
اسی دنیا نے ظالم، اسے دے دی سزا نا

نہ رنگت تھی نظر میں، نہ جینے کی تمنا
رہا یادوں کے صحرا میں جلتا اک دیوانہ

میں ہر پل مر رہا تھا، میں ہر پل جی رہا تھا
مگر دنیا نے تھاما، دیا مجھ کو سہارا

ہوئی شادی تو لیکن وہ پہلی تھی محبت
وہی دردِ نہاں تھا، وہی اشکوں کا دھارا

یہ دل اب بھی اسی کا، یہ دل اب بھی اسی میں
نہ مٹ پایا ہے غم کا وہی نقشِ پرانا

وفا کی داستاں تھی، مقدر کی تھی تحریر
یہی انجام لکھا تھا، یہی رہنا تھا شانہ

نوحہ، ماتمِ عشق

ہجر کی رات، آنکھیں بھیگ رہی ہیں
یادوں کی راکھ، سانسیں چیخ رہی ہیں

عشق کا خواب، پل میں ٹوٹ گیا ہے
دل کی صدا، مگر کون سن رہا ہے؟

وعدے روشنی، بجھ کے رہ گئے سب
خوابوں کی بستیاں، راکھ کہہ گئے سب

زخموں کا رنگ، اب لہو سا نہیں
آنکھوں کا شور، اب عدُو سا نہیں

اب نہ امید، نہ کوئی آس باقی
ماتمِ عشق، بس یہی سانس باقی

جوابِ نوحہ، پیامِ عشق

ہجر کی رات میں سحر بھی ہے
یادوں کی راکھ میں نظر بھی ہے

عشق جب خواب ہو، ٹوٹتا ہی ہے
دل کی صدا ابھی سنائی دے رہی ہے

جو بجھ گئے چراغ، جل بھی سکتے ہیں
یہ ٹوٹے خواب پھر بھی پل سکتے ہیں

زخموں کا رنگ ہی، اصلِ حیات ہے
یہی تو راہ ہے، یہی نجات ہے

عشق کو ماتم نہ کہہ، یہ نور کی راہ ہے
یہی فنا میں بقا کی ایک چاہ ہے

امر جُدائی

چراغِ ہجر میں آنسو جلا گیا کوئی
حیات بھر کا اندھیرا دے گیا کوئی

جوان خواب تھے، بکھرے پڑے ہیں راہوں میں
نظر چرا کے بہت دور جا گیا کوئی

میں جس کے ساتھ بہاروں میں چل پڑا تھا کبھی
خزاں کی راہ دکھا کر چلا گیا کوئی

صدائیں دیتا رہا میں سراب راہوں میں
مگر سُنے بنا مجھ کو رُلا گیا کوئی

یہ عمر بھر کی اداسی، یہ درد کی بارش
محبتوں کو امر کر کے جا گیا کوئی

چراغِ وفا

محبتوں میں وفا کا چراغ جلتا رہے
یہ سلسلہ کسی صورت نہ کم چلتا رہے

تمہاری یاد کا موسم رہے سدا قائم
دِلوں میں عشق کا دریا یونہی پلتا رہے

نظر سے دور سہی، روح میں بسا رکھنا
کہ ترے ہجر کا احساس بھی ملتا رہے

تمہارے قرب کی خوشبو بکھر گئی ہر سو
دعا یہی ہے کہ یہ رنگ یوں ہی کھلتا رہے

یہ دل کی بزم ترے ذکر سے سجی ہر پل
خدا کرے یہ ماحولِ وفا ہر دم سجتا رہے

انتشارِ ذات

ہر ایک شخص یہاں اپنا بادشاہ ہے بنا
دیارِ فکر میں دیوارِ درمیان بنا

یہاں پہ نسل، زباں، فرقہ سب ہی پہلے ہیں
وطن کا نام تو بس ایک داستان بنا

یہ لوگ بیچ رہے ہیں وہی پرانا چورن
جو ان کے وہم میں سچ کا ہے ترجمان بنا

یہاں پہ مسجدیں اینٹوں کی قید میں گم ہیں
کہ ہر کوئی ہی خدا کا ہے رازدان بنا

ندیم! بات تو قوموں کی ایک ہوتی ہے
مگر ہجوم یہ اب تک ہے بے نشان بنا

مسرَف

(گلہ خاورئی باسیوں سے)

حق کے عیاں پر بھی انکار باقی
ظلمت کے پردے میں اسرار باقی

منطق نے تائیدِ حق جب دکھائیَ
وہم و گماں کا تھا رفتار باقی

قبلے کی سمتوں میں تھا انحرافی
میں نے کہا، پھر بھی انکار باقی

حرف و عدد، علم و حکمت سے بولا
تقلیدِ باطل کا اظہار باقی

میں کہہ چکا حرفِ صدق و حقیقت
اُن کے تعصب کا دیوار باقی

سرّ کائنات

فلک کے ہالے میں رموزِ کہن جو مستور تھے،
عدسس سے دیکھے تو وہی زاویے مشہور تھے

منافذِ نور میں پنہاں تھا رازِ ذرّات کا،
کلیمِ فطرت کے ہر اِک قول پر دستور تھے

کہیں جمودِ زماں، کہی گردشیں بے اماں،
نظامِ ہستی میں عجب منطق و معمور تھے

سوادِ کہکشاں میں جو مہتاب محوِ سیر تھا،
وہی تضادِ ضیا میں مقید بہ ناسور تھے

نہ پوچھ حکمت کے نیرنگ میں چھپے راز کیا،
یہاں تو ذرے بھی کبھی موج، کبھی ناسور تھے

طلسمِ دوراں میں جو ہیں زاویے مہ و مہر کے،
وہی تو مکتب میں کبھی نقطۂ معمور تھے

کاش کبھی آ جائے تو

شبنم کے ستاروں میں وہی عکس نمایاں
رہ رہ کے چمکتے ہیں وہی خوابِ شبِ ہجر
دھڑکن میں بسی رہتی ہیں آہوں کی صدائیں
لفظوں میں مچلتی ہیں تری یاد کی لہریں

اب تیرگی سی شب میں کوئی روشنی آئے؟
یا درد کے موسم میں کوئی چاند چمک جائے؟
یا شوق کی رم جھم میں کوئی نغمہ ہی برسے؟
یا ہجر کی وادی میں وصال آ کے مہک جائے؟

گریہ سجدہ گاہِ قدس (شکوہ)

کہاں گئے وہ جو تیغِ یقیں کی ضَو میں جیئے؟

کہاں وہ اہلِ وفا، جو وصالِ حق میں جیئے؟

عدو کے سامنے صف شکن تھے، جبین خم،

مگر رکوع میں، تسلیمِ کبریا میں جیئے۔

کبھی حنین، کبھی بدر میں، عزم بھتا رواں،

کبھی جفا کے سمندر میں، ناوِ جاں میں جیئے۔

خلیلِ طور کے نقشِ قدم کہاں کھو گئے؟

وہ جو شرارۂ شوق وصفا کی حبا میں جیئے۔

کہیں ہے کرب وبلا کی وہ خاکِ جاوید،

کہ جس میں اہلِ یقیں تشنہ کام جا میں جیئے۔

عمار وبلال وصہیب کی وہ اذیتیں،

کہ آہنی سلوں پر بھی نغمہ زن رہے۔

خنجر کی نوک پہ شبیر مسکرا دیے،

سناں کی دھار پہ اک دین کو بقا دیے۔

قریش چھوڑ کے یثرب کو جا بسی دنیا،

وہ قافلہ کہ جو تسلیم کی ادا میں جیئے۔

وہ حرفِ حق جو سلاسل میں گونجتا رہا،

وہ سجدہ گاہ جو سنگ وغبار میں جیئے۔

مگر یہ آج کے بندے ہیں تیرے در پر،

کہ جو قمارِ جہاں کی صدا میں جیئے؟

مناجاتِ اُمّت

اے ربِ جہاں! کیا ہوئے وہ زمانے؟
تھے ہم بھی کبھی تخت و تاج کے شانے

جہاں میں تھی ہم سے جُدا ایک رونق
ہوا کرتے عزت کے پرچم اُٹھانے

مدینے کی گلیوں سے نکلی تھی روشنی
زمانے نے دیکھے تھے وہ کہکشانے

ہمارے ہی سائے میں پلتے تھے غالب
ہمارے ہی دم سے تھے علم و فسانے

تھے رازی و طوسی، وہی ابنِ سینا
ہماری ہی حکمت کے روشن نشانے

کہاں وہ ترانے، کہاں وہ فتوحات؟
کہاں وہ حرم کے وہ سچے دیوانے؟

نہ وہ شانِ ماضی، نہ وہ آبرو ہے
نہ تلواریں وہ، نہ وہ کہکشانے

ہمیں فرقہ بندی نے زخموں میں ڈالا

ہمیں خود فراموشی نے لوٹا خزانے

ترے نام لیوا ہی خستہ ہیں یارب!

ترے در پہ آئے ہیں دل کو جَلانے

نہ دنیا ہماری، نہ دین اپنا باقی

بکھرتے ہی جاتے ہیں ہم بے سُخانے

نہ ایماں، نہ غیرت، نہ سچ کی حرارت

نہ وہ عشق باقی، نہ وہ تیز تانے

ترے در پہ آئے ہیں، فریاد کرتے

کہ بخشے ہمیں پھر وہ روزِ پرانے

ہمیں دے وہ جذبہ، وہ شوقِ شہادت

ہمیں پھر عطا کر وہ سوز و ترانے

کہ پھر سے سنواریں جہاں کو ہدایت

کہ پھر تیرے رستے پہ دل کو لگانے

جو کھویا ہے یارب! وہ واپس ملے گا؟

کہیں پھر اٹھیں گے وہ سب کہکشانے؟

مسلمانوں کے زوال پر مثالیہ (حصہ اول)

یہی تھے جو کل تک زمانے پہ چھائے، کہاں کھو گئی وہ روایات اپنی؟
جو اربابِ دانش تھے، حکمت کے مالک، مٹا دی خرد کی وہ سوغات اپنی؟

جہاں ہم نے تلوار سے راہ پائی، وہی آج غیروں کے در پر گرے ہیں
جو تھے خاکِ بطحا کے روشن ستارے، وہی اپنے سائے سے خائف پھرے ہیں

خلافت کے مینار گر کیسے گئے ہیں؟ یہی تھے جو ظلمت کو مٹنے نہ دیتے
جو قرطاس پر علم کی لو بکھیرے، وہی آج ماضی کو پڑھنے نہ دیتے

کہاں کھو گئے اہلِ ایماں کے جذبے؟ کہاں بجھ گئی شعلہ سامانی اپنی؟
رہی ہم پہ حاکم ستم کی گھٹائیں، لُٹا دی جو ہم نے نگہبانی اپنی

کبھی شام روشن، کبھی قدس آباد، تھے ہر سمت ہم روشنی کی علامت
مگر آج ہیں سرنگوں اپنے در پر، بھلا بیٹھے غیرت کی سب حکمرانی

خدارا اٹھو! پھر سنوارو مقدر، یہ وقتِ سکوں، وقتِ غفلت نہیں ہے
!اگر آج بھی ہم نہ جاگے تو کل تک، ہماری کہانی بھی باقی نہیں ہے

مسلمانوں کے زوال پر مشالیہ (حصہ دوم)

کہاں وہ جلالِ سلاطیں گئے ہیں؟ کہاں وہ شکوہِ عرب رہ گیا ہے؟
جو تھے عرشِ دوراں کے دریانوردہ، وہی خاکِ راہِ طلب رہ گیا ہے

جو خورشیدِ اُمّت تھے، جن کی ضیا سے، زمانہ تھا تابندہ، راہِ وفا میں
وہی رہ گزر میں پڑے ہیں تہی دست، ستم سہ رہے ہیں عدو کی سزا میں

کہاں وہ علوم و فنونِ درخشاں، کہاں حکمت و فلسفہ کی روایات؟
کہاں وہ سُخن کے جہانِ منوّر، کہاں کھو گئے فکر کے سب مقامات؟

یہی تھے جو تقدیرِ عالم کے قاری، یہی تھے جو تدبیرِ فردا کے حامی
مگر آج اپنی ہی غفلت کے مارے، بنے بیٹھے ہیں دشمنوں کے غلامی

وہی ہیں مساجد، وہی ہیں منابر، مگر اہلِ سجدہ کہاں کھو گئے ہیں؟
وہی ہیں کتابیں، وہی ہیں صحیفے، مگر رازِ حکمت کہاں کھو گئے ہیں؟

اُٹھو اے جوانو! یہ وقتِ سکوں نہیں، پھر سے جلاؤ وہ شعلہ کوئی
!جو تاریک راہوں کو کر دے منوّر، جو غفلت کے پردے کو چاک سہی

انسان، ایک فکری و فلسفیانہ تمہید

انسان، وہ معمۂ کائنات جس کی سرشت میں شعور کی وہ تجلی ودیعت کی گئی جو اسے دیگر مخلوقات سے ممیز کرتی ہے، ایک ایسا راز جس کی گرہ کشائی ازل سے اہلِ فکر و دانش کا مطمحِ نظر رہی ہے۔ قرآنِ مجید نے اس صنفِ بشر کو نہایت لطیف مگر دقیق انداز میں متعارف کروایا، جہاں وہ محض گوشت و پوست کا پیکر نہیں بلکہ نورِ ادراک، قوتِ اختیار، اور ابتلا و آزمائش کے مابین جھولتی ہوئی ایک ناپائیدار مگر بالقوّت لافانی حقیقت ہے۔

کلامِ الٰہی کے مطابق، تخلیقِ آدم علیہ السلام محض خاک و گل کا امتزاج نہیں بلکہ وہ مظہرِ ربانی ہے جس میں روحِ الٰہی کی پھونک اسے ایک منفرد شان عطا کرتی ہے۔ یہی وہ نکتۂ عظیم ہے جہاں فرشتے انگشت بدنداں رہ گئے اور ابلیس کی سرکشی اس حقیقت سے متصادم ہو کر اسے لعنتِ دوام کا سزاوار ٹھہراتی ہے۔ یہ تخلیقی مظہر انسان کو دیگر مخلوقات سے یوں ممتاز کرتا ہے کہ جہاں دیگر اجسامِ موجودات جبر کے تابع ہیں، وہیں انسان ارادہ و اختیار کی نعمت سے بہرہ مند ہے، جو اسے خیر و شر کے مابین انتخاب کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

انسانی فطرت کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں خیر و شر، حلم و جبر، ضبط و طغیان، اور تقویٰ و سرکشی کی دو متوازی لہریں مد و جزر کی مانند رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وہ متضاد عناصر ہیں جو انسان کے وجود میں نیکی اور بدی کی کشاکش کو جنم دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے بارہا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ انسان اپنی جبلت میں کمزور، جلد باز، حرص و آز میں غرق ہونے والا اور اکثر غفلت شعار ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ خدائی عطا کردہ "علم الاسما" کا حامل بھی ہے، جو اس کی عظمت و برتری کا سنگِ بنیاد ہے۔

یہ کتاب، انسان کے تخلیقی پہلو، اس کی جسمانی و روحانی ترکیب، اس کے شعور و لاشعور، اور اس کے فکری و جذباتی ارتقا کو نہایت گہرائی میں جا کر ماہرینِ فلسفہ، علمائے روحانیت، اور مفسرینِ کلامِ الٰہی کی نگاہ سے جانچے گی۔ اس میں قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، اور تاریخی و سائنسی شہادتوں کو مجتمع کر کے ایک ایسا فکری و ادبی منظرنامہ تخلیق کیا جائے گا، جو قاری کو محض مطالعہ کی سطحی تسکین نہیں بلکہ فکر و تدبر کی وادی میں سرگرداں کر دے۔

انسان کی تخلیق، قرآنی نقطۂ نظر

تخلیقِ انسانی کا راز ازل سے اربابِ فکر و دانش کے لیے ایک پیچیدہ معمّا رہا ہے، جسے قرآنِ مجید نے نہایت جلال و جمال کے امتزاج کے ساتھ آشکار کیا ہے۔ انسان محض مٹی کا پتلا نہیں، بلکہ وہ ایک ایسا لطیف مگر پیچیدہ مظہر ہے، جس میں خاکی جوہر کے ساتھ ساتھ وہ روحانی جوہر بھی پیوست ہے جسے خداوندِ قدوس نے اپنے امر سے پھونکا۔ یہی دو عنصری امتزاج اسے ملائکہ سے ممتاز اور دیگر تمام مخلوقات پر شرف عطا کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم تخلیقِ انسانی کے مراحل کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے، جہاں ابتدا میں انسان کی اصل گیلی مٹی، سخت مٹی، اور سیاہ اور بدبو دار گارا سے منسوب کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الحجر میں ارشاد فرماتا ہے

اور بے شک ہم نے انسان کو بجنے والی، سڑے ہوئے گارے کی مٹی سے پیدا کیا۔ (الحجر: 26)

یہاں مٹی کی مختلف کیفیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کی اصل نہ صرف مادی عناصر پر مشتمل ہے بلکہ وہ ایک مخصوص مرحلے سے گزر کر اپنے جُزءِ ترکیبی کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ سورۃ السجدہ میں یوں بیان فرماتا ہے

پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دی، اور تمہیں سماعت، بصارت اور دل عطا کیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ (السجدہ: 9)

یہاں ایک نہایت دقیق حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ انسانی تخلیق محض مادّی نہیں، بلکہ اس میں ایک غیر مادی جوہر یعنی روح بھی شامل ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے امر سے ودیعت کیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان کو اس کی شعوری و ادراکی صلاحیتیں عطا کی گئیں اور وہ ایک بلند مقام پر فائز کیا گیا۔

ملائکہ اور ابلیس کا امتحان

جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ یہاں علم، روحانی بصیرت، اور خدا کے فیصلے کے سامنے تسلیم و رضا کا ایک عظیم امتحان برپا ہوا۔ سورۃ البقرہ میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا، اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

(البقرہ: 34)

یہاں ایک نکتہ نہایت لطیف مگر انتہائی گہرے فکری ابعاد کا حامل ہے کہ انسان کی برتری کی بنیاد اس کی مٹی نہیں، بلکہ اس میں موجود علم، اختیار، اور روحانی لطافت ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جو فرشتوں کو نظر نہ آئی، اور ابلیس نے بھی ظاہری تخلیقی عناصر کی بنیاد پر آدم کو حقیر جانا۔

علم الاسما اور انسان کی برتری

قرآنِ کریم نے انسان کی فضیلت کو محض اس کے تخلیقی جوہر سے منسلک نہیں کیا، بلکہ اس کا ایک اور پہلو بھی اجاگر کیا، جو اس کی عقلی و علمی استعداد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے اور فرشتوں کے سامنے ان کے علمی تفاوت کو واضح فرمایا

اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔

(البقرہ: 31)

یہ وہ مقام ہے جہاں انسانی وجود کی سب سے بڑی برتری سامنے آتی ہے۔ انسان کو "علم الاسما" عطا کیا گیا، یعنی اشیا کی ماہیت و حقیقت کی پہچان، اور نام رکھنے کی صلاحیت جو در حقیقت کائنات کے فہم اور اس پر قابو پانے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

انسان کی تخلیق کا مقصد

یہ تمام قرآنی بیانات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کوئی اتفاقی امر نہیں، بلکہ ایک نہایت بامقصد اور متعین منصوبے کے تحت ہوئی۔ اسے زمین پر خلافت دی گئی، علم عطا کیا گیا، اور اسے خیر و شر میں تمیز کا شعور دے کر آزمائش میں ڈالا گیا۔ قرآن بارہا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انسان کو محض پیدا کر کے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا، بلکہ اس کی ہر سانس، ہر عمل اور ہر ارادہ ایک عظیم مقصد کا حصہ ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

کیا تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں جاؤ گے؟ (المؤمنون : 115)

یہی وہ حقیقت ہے جس پر غور کرنا انسان کی بقا، اس کی معرفت، اور اس کے انجام کی کنجی ہے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش اور خلافتِ ارضی

انسانی تخلیق کی محض مادی جہت ہی نہیں، بلکہ اس کی بعثت اور اس کے لیے متعین کردہ منصبِ خلافت بھی ایک ایسا دقیق موضوع ہے، جس پر قرآنِ حکیم نے بارہا روشنی ڈالی ہے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کو وجود میں لایا گیا، تو ان کی تخلیق کا مقصد صرف ایک جسمانی مخلوق کی تشکیل نہ تھا، بلکہ انہیں زمین پر ایک ایسے نظام کی سربراہی کے لیے چنا گیا جو خیر و شر، عدل و ظلم، اور حق و باطل کی کشاکش کا مرکز ہوگا۔

آدم علیہ السلام، ایک عظیم امانت کا حامل

قرآنِ مجید میں سب سے پہلے خلافتِ انسانی کے تصور کو پیش کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہوتا ہے

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو مقرر کرے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے؟ حالانکہ ہم تیری حمد و تقدیس کرتے ہیں؟ فرمایا میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (البقرہ : 30)

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی پیدائش کے پیچھے ایک بڑا الٰہی منصوبہ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض آزمائش کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ اسے زمین پر ایک خلیفہ مقرر کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی فرشتوں کے استفہام نے اس امر کی نشاندہی کر دی کہ انسان کی سرشت میں ایک ایسا میل موجود ہے، جو اسے خیر اور شر دونوں کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔

خلافت کا مفہوم اور اس کی معنویت

لفظ خلیفہ محض ایک جانشین یا نائب کے معنوں میں نہیں آتا، بلکہ اس میں کئی جہات شامل ہیں۔

حکمرانی اور عدل، خلافت کا مطلب زمین پر انصاف اور خدا کی شریعت کو نافذ کرنا ہے۔

آزمائش اور امتحان، چونکہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے، اس لیے اس کی خلافت کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔

علم اور تفکر، اللہ تعالیٰ نے آدم کو علمِ اشیا عطا کر کے اسے دوسروں پر برتری دی، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔

عبادت اور بندگی، انسان کی خلافت محض دنیاوی حکمرانی نہیں، بلکہ اس کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی ہے، جیسا کہ فرمایا

اور میں نے جن و انس کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ (الذاریات: 56)

یہ تمام عناصر خلافتِ انسانی کے جوہر کو متعین کرتے ہیں۔

آدم علیہ السلام کا زمین پر اتارا جانا

جب شیطان نے آدم اور حوّا کو جنت میں بہکا کر ممنوعہ درخت کا پھل کھلایا، تو انہیں زمین پر بھیج دیا گیا۔ مگر یہ اخراج محض ایک سزا نہ تھی، بلکہ زمین پر خلافت کے منصب کا آغاز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بابت فرمایا

ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے، تو جو اس کی پیروی کرے گا اس پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ (البقرہ: 38)

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کی حقیقت بیان کر دی کہ زمین اس کے لیے ایک امتحان گاہ ہوگی، جہاں وہ اپنی آزادی اور اختیار کو خیر یا شر میں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انسان کی ذمہ داری

یہ خلافت ایک بہت بڑی امانت ہے، جسے زمین و آسمان نے قبول نہ کیا، مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ جیسا کہ فرمایا

بے شک ہم نے اس امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، مگر انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے، لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور نادان ہے۔ (الاحزاب: 72)

یہ حقیقت انسان کی سرشت کی پیچیدگی کو بیان کرتی ہے۔ اس کے اندر روشنی اور تاریکی، اطاعت اور سرکشی، فطرتِ خیر اور طبیعتِ شر دونوں موجود ہیں۔ اس کا امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی خلافت کو عدل، تقویٰ اور حکمت کے ساتھ ادا کرے، ورنہ یہی اختیار اسے اسفل السافلین میں بھی لے جا سکتا ہے۔

انسان کی تخلیق میں مٹی، روح اور ارادہ

انسانی وجود کی ماہیت محض جسمانی نہیں، بلکہ اس کی ساخت میں تین بنیادی عناصر شامل ہیں: مٹی (جسمانی مادہ)، روح (الٰہی عنصر)، اور ارادہ (آزمائش کی اساس)۔ قرآنِ مجید ان تینوں اجزاء کی تخلیق، ان کے باہمی تعلق اور ان کی حقیقت پر کئی مقامات پر روشنی ڈالتا ہے، جو اس راز کو کھولتے ہیں کہ انسان محض خاکی وجود نہیں، بلکہ ایک ماورائی حقیقت بھی رکھتا ہے۔

مٹی، جسمانی تخلیق کی اساس

انسان کی تخلیق کا بنیادی جوہر مٹی ہے، جسے قرآن مختلف الفاظ میں بیان کرتا ہے: طین (گیلی مٹی)، صلصال (سوکھی مٹی)، حَمَإٍ مَّسۡنُوۡنٍ (بدبودار سیاہ مٹی) اور تُراب (خشک خاک)۔ ان تمام قرآنی اصطلاحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق تدریجی مراحل میں ہوئی، اور مٹی کی مختلف کیفیات سے گزرتی رہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ (المؤمنون: 12)

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان کی تخلیق کوئی فوری عمل نہ تھا، بلکہ "سُلٰلَۃ" یعنی کشیدگی و صفائی کے ایک طویل حیاتیاتی و کیمیائی عمل سے گزری۔ ایک اور مقام پر اللہ فرماتا ہے

اس نے انسان کو خشک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جیسے کمہار کی مٹی ہوتی ہے۔ (الرحمٰن: 14)

یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تخلیق کا یہ مرحلہ پختگی، سختی، اور ساختیاتی استحکام پر مشتمل تھا۔

روح، الٰہی نور اور انسان کی حقیقت

انسان کی جسمانی تخلیق کے بعد ایک ایسا مرحلہ آیا، جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کر دیتا ہے: روح کا نفخ۔ یہی وہ امر ہے جس نے حیوانی خاکی پیکر کو شعور، ارادہ، اور ملکوتی جوہر عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

(ص: 72)

یہاں اللہ نے روح کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی، جو اس بات کا اظہار ہے کہ یہ محض جسمانی طاقت نہیں، بلکہ ایک ماورائی حقیقت ہے، جو انسان کو زمین پر خلافت کے قابل بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان میں عقل، شعور، اور حق و باطل کی تمیز پیدا ہوئی، جو کسی اور مخلوق میں اس درجے کی موجود نہیں۔

ارادہ، خیر و شر کا انتخاب

اگر انسان محض مٹی اور روح کا مرکب ہوتا، تب بھی اس میں فرشتوں یا دیگر مخلوقات کی طرح جبری اطاعت ہوتی۔ مگر اللہ نے اس میں ارادہ اور اختیار رکھا، تاکہ وہ آزمائش کے عمل سے گزر سکے۔

اور ہم نے اسے دو راستے دکھا دیے۔ (البلد: 10)

یہ دو راستے خیر اور شر، ہدایت اور گمراہی، روشنی اور تاریکی کے راستے ہیں، جن میں سے انسان نے اپنے ارادے سے کسی ایک کو چننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فرشتوں سے بلند بھی ہو سکتا ہے اور حیوانات سے بھی بدتر گر سکتا ہے

ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا، پھر ہم نے اسے پست سے پست تر درجے میں پھینک دیا۔ (التین: 4-5)

یہ آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان اپنی مرضی سے جنتی یا جہنمی بن سکتا ہے، کیونکہ اس میں خیر و شر کا ادراک بھی ہے اور اختیار بھی۔

قرآن میں انسان کی حقیقت اور مقام

انسان کی حقیقت اور اس کا مقام قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، جہاں اس کے عالی مقام اور عظمت کو متعین کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد اور عظمت کے لیے پیدا کیا، اور اس کے اندر وہ صلاحیتیں رکھی ہیں جن سے وہ دنیا میں اپنی اہمیت کو جان سکے اور اس کا مقصدِ حیات سمجھ سکے۔

انسان کی عزت اور عظمت

قرآن میں انسان کو تمام مخلوقات میں سب سے عظیم اور شرف یافتہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ نے اپنی حکمت سے انسان کو ایسی صفات عطا کیں، جو اسے باقی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا، اور ہم نے انہیں ہر قسم کی پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، اور ہم نے انہیں اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی۔ (الإسراء: 70)

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان کا بنیادی مقام اشرف المخلوقات کا ہے اور اسے اس کی پیدائش میں ایک خاص وقار اور عزت دی گئی ہے، جو دوسرے تمام مخلوقات سے نمایاں ہے۔ اللہ کی فطری حکمت کا تقاضا ہے کہ انسان کے اندر علم، عقل، سوچنے کی صلاحیت اور اختیار جیسی خصوصیات ہوں تاکہ وہ خود کو سمجھ سکے اور اپنے مقصدِ حیات کو پہچان سکے۔

انسان کی آزاد مرضی اور اختیار

انسان کو اللہ نے آزاد مرضی دی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی تقدیر کو خود بنا سکتا ہے۔ اختیار اور ارادہ کا یہ حق اسے دوسرے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، جو اللہ کے فیصلوں کے پابند ہیں۔ انسان کی یہی آزادی اس کے لئے آزمائش بن کر آتی ہے، کیونکہ اسے اپنی مرضی اور فیصلوں کے نتائج کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، چاہے شکر گزار ہو جائے یا ناشکرا۔ (الإنسان: 3)

یہ آیت انسان کو اختیار کی آزادی دیتی ہے، اور اس کا فیصلہ اسے خود کرنا ہوتا ہے کہ وہ شکر گزار بنے یا کفر کرے۔ یہ انسانی زندگی کا بنیادی تعلق اور چیلنج ہے، جس کا سامنا وہ روزانہ کرتا ہے۔

انسان کا اخلاقی مقام

انسان کو اللہ کی طرف سے عطا کی گئی اخلاقی اقدار کی بدولت وہ اپنی زندگی میں صواب اور گناہ میں فرق کر سکتا ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک ضمیر دیا ہے، جو اسے صحیح اور غلط کا شعور دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بار بار اس کی ہدایت اور اخلاقی ترقی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے

اور نفس کی قسم، اور اس کے بنانے والے کی قسم، پھر اس نے اسے گناہ اور تقویٰ کی سمجھ دی۔ (الشمس : 7-8)

اس آیت میں انسان کے اخلاقی شعور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے عمل کا محاسبہ کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انسان کا مقصدِ حیات

قرآنِ مجید میں انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اللہ کی عبادت اور اس کی رضا کی کوشش بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اللہ کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارے اور اس کی رضا کے لئے اپنی زندگی کو صرف کرے۔ اللہ فرماتا ہے

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ (الذاریات : 56)

یہ آیت انسان کے مقصدِ حیات کو نہایت سادگی سے بیان کرتی ہے کہ اس کی وجود کا اصل مقصد اللہ کی عبادت اور اس کی رضا کی کوشش ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کا مقصد سمجھ کر اسے درست طریقے سے گزارے، تو وہ اپنی تخلیق کا صحیح مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

انسان کی ذمہ داری اور آزمایش

انسان کو اللہ نے زمین پر خلیفہ کے طور پر بھیجا ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں، بلکہ اس کو زمین کی حفاظت اور دیگر مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے

یقیناً میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (البقرۃ: 30)

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان کو اللہ کی امانت سمجھ کر زمین کی خدمت کرنا ہے۔ یہ آزمائش کا وقت ہے، جہاں اسے اپنی نیک نیتی اور انصاف کے ساتھ عمل کرنا ہے۔

انسان کی تخلیق اور فرشتوں کے اعتراضات

قرآن میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اعتراضات اور ان کے رد عمل کو بھی بیان کیا ہے۔ فرشتے اللہ کی عظمت اور حکمت سے واقف ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا ارادہ کیا تو ان کے دل میں شک و سوالات اٹھے۔ یہ اعتراضات انسانی نقصان اور فساد کی ممکنہ موجودگی کے حوالے سے تھے، لیکن اللہ نے انسان کی تخلیق کے پیچھے اپنی حکمت اور مقصد کو واضح کیا۔ اس اعتراض کے ذریعے انسان کی تخلیق کی حقیقت اور اللہ کے فیصلوں کی برتری کو سمجھنا ضروری ہے۔

فرشتوں کا اعتراض

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی تخلیق کے لیے منتخب کیا، تو فرشتوں نے یہ سوال کیا

کیا تو اس میں وہ شخص پیدا کرے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں؟ (البقرۃ: 30)

فرشتوں کا یہ اعتراض اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان میں خود غرضی، فساد اور قتل و خونریزی کی صلاحیت ہے، جو انسان کی تخلیق کی وجہ سے ایک خطرہ ہو سکتی ہے۔ فرشتوں نے اپنی نیک فطرت کی بنیاد پر یہ سوال کیا کہ اللہ کی حکمت کا کیا جواز ہے کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو زمین میں فساد ڈالے۔

اللہ کا جواب

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا

یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (البقرۃ: 30)

یہ جواب نہ صرف اللہ کی حکمت کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ یہ انسان کی تخلیق کی حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے۔ اللہ کا یہ فرمان بتاتا ہے کہ فرشتوں کی نیک فطرت اور چاندی میں کوئی کمی نہیں تھی، مگر انسان کو ایک آزادی اور اختیار دیا گیا ہے، جو اس کی آزمائش اور مقصد کی بنیاد ہے۔ اللہ کا علم وسیع ہے، اور وہ اپنی کائناتی حکمت کے مطابق انسان کو تخلیق کرتا ہے، چاہے انسان میں کوئی خامی یا کمی ہو، وہ کسی اعلیٰ مقصد کے تحت ہے۔

انسان کا خاص مقام

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم دیا جو فرشتوں سے بلند تھا۔ اللہ نے حضرت آدم کو تمام مخلوقات کا علم سکھایا اور فرشتوں کی تسبیح اور تقدیس کے باوجود انسان کو عقل و فہم میں فوقیت دی۔ اللہ نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، جس سے فرشتوں کو یہ سمجھ آ گیا کہ انسان کا مقام اللہ کے نزدیک زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تو فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ (البقرۃ: 34)

اس آیت میں فرشتوں کے سجدے اور ابلیس کے انکار کو ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ نے انسان کو ایک خاص مقام دیا ہے، جو علم اور عقل کے ذریعے اسے دوسرے مخلوقات پر ممتاز کرتا ہے۔

انسان کی اہمیت اور آزمائش

اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ انسان کو کامیابی اور ناکامی کی آزادی دے کر اس کی آزمائش کی جائے۔ یہ نہ صرف انسان کے لئے بلکہ فرشتوں اور دنیا کی تمام مخلوقات کے لیے ایک درس تھا کہ اللہ کے فیصلے غیب کی حکمت پر مبنی ہیں۔ اس آزمائش میں انسان کی صلاحیتیں اور خواہشات اس کی آخری کامیابی یا ناکامی کی بنیاد بنیں گی۔

انسان کی خصوصیت، علم واختیار کا امتزاج

انسان کی تخلیق کا مقصد صرف ایک جسمانی وجود نہیں تھا، بلکہ اللہ نے انسان کو روح، اختیار اور علم جیسے اہم عناصر عطا کیے تاکہ وہ اپنی تقدیر کو خود چن سکے۔ یہ اس کی تخلیق کی حکمت کو واضح کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اس کے اختیار اور علم کے ذریعے آزمائش میں ڈالا۔ اللہ کا فرمان ہے

اور اللہ نے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ (البقرۃ : 31)

یہ آیت انسان کو دی جانے والی علمی فوقیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو انسان کے کردار کی بنیاد ہے۔ یہ اس کے اختیارات اور خودمختاری کو اس کے علم کے ساتھ جوڑتا ہے، تاکہ وہ اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق گزار سکے۔

انسان کی عقل، شعور اور ارادے کی آزادی

انسان کی تخلیق میں ایک اہم پہلو اس کی عقل، شعور اور ارادے کی آزادی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی خصوصیات عطا کی ہیں جو اسے تمام مخلوقات میں ممتاز کرتی ہیں۔ انسان کو عقل دی گئی ہے، جو نہ صرف اس کے شعور کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اسے اختیار اور ارادے کی آزادی بھی دیتی ہے۔ یہ آزادی انسان کو اپنے فیصلوں کا موثر اختیار فراہم کرتی ہے، اور اس کے ذریعے انسان اپنی تقدیر کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

عقل کی اہمیت اور انسان کی تمیز

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل، شعور اور فہم سے نوازا، تاکہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ سکے، کائنات کی حقیقتوں کو جان سکے اور اپنے اندر کی روحانی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

تمہارا رب جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو، وہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکمت والا ہے۔ (الاسرا : 3)

اس آیت میں انسان کی عقل کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس کی پختگی اور فہم کی عکاسی کرتی ہے۔

ارادے کی آزادی اور انسان کی ذمہ داری

اللہ نے انسان کو اپنی آزادی اور اختیار دیا تاکہ وہ اپنی زندگی کے راستے کو منتخب کر سکے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ہم نے انسان کو راستہ دکھایا ہے، چاہے وہ شکر گزار ہو یا کفر کرنے والا۔ (الدھر: 3)

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ انسان کو راہِ حق یا راہِ گمراہی کے انتخاب میں مکمل آزادی دی گئی ہے، اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ کس راستے کو اختیار کرتا ہے۔

عقل اور ارادے کا باہمی تعلق

انسان کی عقل اور ارادے کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ انسان کی عقل اسے سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہے، لیکن اس کی آزادی اور ارادہ اس کو اس فیصلے کی ذمہ داری سے بھی روبرو کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ انسان کے فیصلے عقل کے ذریعے ہوں گے، مگر اس کا ارادہ اور اختیار فیصلہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

اللہ کی حکمت کو بیان کرتے ہوئے، قرآن میں فرمایا

تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ چاہے۔ (الانسان: 30)

یہ آیت انسان کی آزادی اور ارادے کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ اللہ کی مشیت کے تحت انسان کو ارادہ کرنے کی آزادی دی گئی ہے، مگر اس کی زندگی کا تمام سفر اللہ کی مرضی سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

عقل و ارادہ، انسان کی کائنات سے تعلق

انسان کی عقل اور ارادہ اس کے کائنات سے تعلق کو منظم کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی اپنی زندگی میں کرتا ہے، وہ اس کی عقل اور ارادے کے ذریعے عمل میں آتا ہے، اور اس کے فیصلے اس کی تقدیر کا حصہ بنتے ہیں۔ انسان اپنی رائے اور فیصلے کے ذریعے خود کو اپنی تقدیر کا مالک سمجھتا ہے، مگر وہ ہمیشہ اللہ کی ہدایت اور غیبی حکمت کے تحت عمل کرتا ہے۔

انسان کی آزمایش، ارادہ اور فیصلہ

انسان کی عقل اور ارادہ اسے ایک اہم آزمایش میں ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے تاکہ وہ اپنی تقدیر اور مقصد کا انتخاب کرے، لیکن اس کا فیصلہ آخر کار اللہ کی مرضی کے تحت ہے۔ یہ آزمایش انسان کی روحانیت اور فکر کو اجاگر کرتی ہے، اور اسے یہ سکھاتی ہے کہ وہ غیبی حقیقتوں کو سمجھنے کے بجائے اپنی آزادی میں اللہ کی ہدایت کو اختیار کرے۔ اللہ کا فرمان ہے

وہ شخص کامیاب ہوگا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا، اور وہ ناکام ہوگا جس نے اسے گناہ میں ڈبو دیا۔ (الشمس : 9-10)

اس آیت میں نفس کی پاکیزگی اور ارادہ کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان کو غیبی حقیقتوں کے علم سے آگاہ کیا گیا ہے، جو اس کے فیصلے اور عقل کی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔

انسان کی فطری کمزوریاں اور خطا کاری

انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں بعض کمزوریاں اور خطا کا عنصر شامل کیا ہے، جو اس کی انسانیت کا حصہ ہیں۔ ان کمزوریوں کا مقصد انسان کو اپنی حقیقت اور مقصدِ حیات کو سمجھنے کی دعوت دینا ہے۔ قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے خطا کا شکار ہوتا ہے، اور یہ اس کے امتحان کی نوعیت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آزادی دی ہے اور اس کے فیصلوں کا ذمہ دار خود انسان ہے۔

فطری کمزوری اور انسان کا تنازعہ

انسان کی فطرت میں کمزوری اور خطا کا پہلو اس کی آزادی اور اختیار کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت کے مطابق پیدا کیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں کمزوری اور گناہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھی۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے :

اللہ نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا اور پھر وہ بڑا جھگڑالو بن گیا۔ (یٰسین : 77)

یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ انسان کی فطرت میں جھگڑا اور خطا شامل ہے، اور یہی اس کی کمزوری ہے۔

خطاکاری اور انسان کا آزمایشی سفر

انسان کی خطاکاری اس کے آزمایش کے سفر کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی آزادی دی ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے اچھے یا برے عمل کا انتخاب کرے، اور اس کے نتیجے میں وہ سزا یا انعام کے لائق ہوگا۔ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے

اور جب وہ بے حیائی کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبا اجداد کو اس پر عمل کرتے پایا ہے، اور اللہ نے ہم پر یہ حکم دیا ہے۔ تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو، کیا تم نہیں جانتے؟ (الاعراف: 28)

اس آیت میں خطا اور فطری کمزوری کے ساتھ انسان کی آزمائش کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

انسان کی فطرت اور اس کا فیصلہ

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی فطرت کے مطابق پیدا کیا ہے، جو کہ حسن اور برائی کی تفریق کا آغاز ہے۔ انسان کی خودمختاری کے باوجود، اس میں کمزوری اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی صلاحیت ہے، جو اس کی فطری حالت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی، تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤ۔ (ص: 72)

یہ آیت انسان کے روحانی مقام کو ظاہر کرتی ہے، مگر اس میں خطا اور کمزوری کا پہلو بھی شامل ہے۔

توبہ اور خطا کی اصلاح

انسان کے اندر کمزوری اور گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود، اللہ نے اس کو توبہ اور معافی کی صلاحیت دی ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے

اور جب وہ تمہارے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں، اے ہمارے رب، ہمارے گناہ معاف کر دے، اور ہماری برائیاں مٹا دے، اور ہمیں صالحین کے ساتھ موت دے۔ (آل عمران: 193)

یہ آیت انسان کو اپنی خطا کی اصلاح اور اللہ سے مغفرت کی اہمیت یاد دلاتی ہے۔

خطا اور اللہ کی حکمت

اللہ کی حکمت انسان کی خطاکاری کو ایک وسیلہ بنا دیتی ہے تاکہ انسان اپنی غفلت اور گناہ کا شعور حاصل کرے اور اپنے اندر کی روحانی اصلاح کی کوشش کرے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا

اور اللہ ان کو عذاب نہیں دے سکتا جب تک کہ تم ان کے درمیان موجود ہو اور جب تک کہ وہ استغفار نہ کریں۔ (الأنفال :33)

اس آیت میں توبہ اور اللہ کی مغفرت کی حقیقت بیان کی گئی ہے، جو انسان کی خطا کی اصلاح کا ایک اہم طریقہ ہے۔

انسان اور آزمائش، دنیاوی زندگی کا فلسفہ

دنیا میں انسان کی تخلیق کا مقصد محض عیش و آرام یا خوشی کا حصول نہیں ہے، بلکہ اسے آزمائشوں اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے ایمان اور صبر کا امتحان دے سکے۔ یہ آزمائشیں انسان کی روحانی ترقی کے لیے ایک ذریعہ ہیں، جو اس کی قلبی صفائی اور اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کیا کہ زندگی میں مشکلات اور آزمائشیں انسان کو درپیش آئیں گی، اور یہ سب کچھ اس کی آزمائش کا حصہ ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیت، استقلال، اور ایمان کو ثابت کر سکے۔

زندگی کی آزمائش کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ آزمائشوں سے گزرے اور اپنی ایمان اور نیک عمل کے ذریعے اللہ کے قریب ہو سکے۔ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے

اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی سے آزمائیں گے، یہ سب آزمائش ہے، اور تمہیں ہماری طرف واپس آنا ہے۔ (الأنبياء :35)

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی مشکلات اور آزمائشیں اللہ کی طرف سے فطری ہیں، اور ان کا مقصد انسان کی روحانی تربیت اور صبر کی جانچ ہے۔

آزمائشوں کا تعلق انسان کی فطرت سے

انسان کی فطرت میں کمزوری اور خطا کا پہلو موجود ہے، اور یہی اس کی آزمایش کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے فیصلہ کرے، اور ان فیصلوں کا اثر اس کی زندگی پر پڑتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تاکہ اللہ پاک اور ناپاک میں فرق کرے، اور ناپاک کو دوسرے ناپاک پر غالب کر دے، پھر ان سب کو جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ خسارے میں ہیں۔ (آل عمران : 179)

یہ آیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ آزمائشیں انسان کے ایمان اور عمل کو جانچنے کا ذریعہ ہیں تاکہ اللہ دیکھ سکے کہ وہ کس طرح اپنی فطری کمزوری اور چیلنجز کا سامنا کرتا ہے۔

آزمائشوں کے ذریعے اللہ کی محبت کا حصول

دنیا میں انسان کی آزمائشوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرے اور اس کی رضا کے لیے عمل کرے۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس یہ کہہ کر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے، اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی؟ (العنکبوت : 2)

اس آیت میں اللہ نے اس بات کو واضح کیا کہ ایمان لانے کے بعد انسان کو اپنی ایمانداری کو آزمائشوں کے ذریعے ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ان آزمائشوں میں صبر، شکر، اور اللہ کی رضا کا حصول ہے۔

زندگی کی آزمائشوں میں صبر کا مقام

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو صبر کی تعلیم دی ہے تاکہ وہ دنیا کی مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کر سکیں۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (البقرۃ : 156)

یہ آیت صبر اور اللہ کی رضا کو یاد دلاتی ہے، جو انسان کو زندگی کی آزمائشوں میں دلی سکون فراہم کرتی ہے۔

آزمائشوں کے بعد کا انعام

زندگی کی آزمائشوں اور مشکلات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے لیے بہترین انعامات تیار کرتا ہے۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

یقیناً صبر کرنے والوں کو ان کا انعام بے شمار دیا جائے گا۔ (الزمر: 10)

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زندگی کی مشکلات میں صبر اور اللہ پر توکل انسان کو دنیوی اور آخروی کامیابی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

قرآن اور جدید سائنسی نظریات، انسان کی تخلیق

قرآن کی تعلیمات اور جدید سائنسی تحقیق میں انسان کی تخلیق کے حوالے سے کئی مماثلتیں اور ہم آہنگیاں ملتی ہیں، جو ہمیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ کی جانب سے دنیا اور انسان کی تخلیق کا جو مفہوم قرآن میں بیان کیا گیا ہے، وہ نہ صرف روحانی بلکہ سائنسی طور پر بھی درست ہے۔ قرآن میں انسان کی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، وہ سائنس کی جدید دریافتوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے، جو ایک نشان ہیں اللہ کی حکمت اور اس کی علمی قدرت کی۔

قرآن میں اللہ نے انسان کی تخلیق کے آغاز کو پانی سے جوڑا ہے، جو سائنسی طور پر بھی درست ثابت ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا

اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟ (الأنبیاء: 30)

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اور دیگر جانداروں کی تخلیق کا آغاز پانی سے ہوا تھا، جو کہ حیاتیاتی سطح پر حقیقت ہے، کیونکہ تمام زندگی کی بنیاد پانی پر ہے۔ سائنس میں بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ زندہ جانداروں کا وجود بنیادی طور پر پانی کی موجودگی سے وابستہ ہے۔

قرآن میں اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کا ذکر کیا ہے، جو سائنسی طور پر انسان کی حیاتیاتی تخلیق کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے۔ اللہ نے فرمایا

اور ہم نے انسان کو مٹی کے ایک قطرے سے پیدا کیا۔ (المؤمنون: 12)

یہ آیت انسان کی حیاتیاتی تخلیق کی وضاحت کرتی ہے۔ سائنسی تحقیقات کے مطابق انسان کی جسمانی ساخت کا آغاز مختلف کیمیائی عناصر سے ہوتا ہے، جو زمین کی مٹی میں پائے جاتے ہیں، جیسے کاربن، آکسیجن، نائٹروجن، وغیرہ۔

قرآن میں جنین کی تخلیق اور اس کی مختلف مراحل میں ترقی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اور ہم نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت دی۔ (الإنسان : 2)

یہ آیت جنین کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے کی وضاحت کرتی ہے، جو نطفہ سے شروع ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس میں سننے اور دیکھنے کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جدید سائنسی تحقیقات میں بھی جنین کی ترقی اور اس میں مختلف اعضاء کی تشکیل کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو قرآن کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

ہم نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا۔ (النساء : 1)

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی تخلیق کا آغاز ایک فرد سے ہوا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ سائنسی طور پر بھی یہ تصور پایا جاتا ہے کہ انسان کی ابتداء ایک مشترکہ اجداد سے ہوئی، اور آج کے انسان کی مختلف نسلیں ان ہی اجداد کی شاخیں ہیں۔

قرآن میں اللہ نے انسان کو جو عقل اور شعور دیا، وہ اس کی تخلیق کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اللہ نے فرمایا

اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ (ص : 72)

یہ آیت انسان کی روحانی تخلیق اور دماغ کے شعور کی اصل کو ظاہر کرتی ہے۔ سائنسی طور پر بھی دماغ کی ساخت اور اس کی فعالیت کی تفصیل عصبی سائنس اور نیوروسائنس میں کی جاتی ہے، جہاں دماغ کو انسان کی فکری اور روحانی صلاحیتوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

قرآن میں اللہ نے انسان کی نسلوں کے تسلسل اور اس کی پیدائش کے مختلف مراحل کی وضاحت کی ہے۔ اللہ نے فرمایا

اور ہم نے تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ (الحجرات : 13)

یہ آیت انسان کی نسلی ترقی اور تنوع کی وضاحت کرتی ہے، جو سائنسی طور پر بھی درست ہے۔ سائنسی تحقیق میں انسان کی نسلی ترقی اور جینیاتی تنوع کا بھی ذکر ہے، جو انسان کے آغاز سے لے کر آج تک کے سفر کا حصہ ہے۔

قرآن میں انسان کی تخلیق کے جو پہلو بیان کیے گئے ہیں، وہ نہ صرف روحانی بلکہ سائنسی لحاظ سے بھی مکمل ہیں۔ قرآن کی تعلیمات اور جدید سائنسی دریافتیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ کی حکمت اور علم نے انسان کی تخلیق کے عمل میں تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر ہم

آہنگ کیا ہے۔ انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن کی وضاحتیں اور سائنسی حقائق کی مطابقت اس بات کا غماز ہے کہ قرآن صرف مذہبی کتاب نہیں بلکہ ایک جامع اور علمی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔

انسان اور جنّات، تخلیق میں فرق اور تقابل

قرآن میں اللہ تعالی نے انسان اور جنّات کی تخلیق کو ایک خاص انداز سے بیان کیا ہے، جہاں دونوں کی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اللہ کی عبادت اور معرفت ہے، جبکہ جنّات کی تخلیق کا مقصد بھی اللہ کی عبادت ہی ہے، مگر ان دونوں کی نوعیت اور تخلیق کے طریقہ کار میں اہم فرق ہے۔

قرآن میں اللہ تعالی نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا ہے، جیسے فرمایا

اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، جو کھنکنے والی مٹی کی مانند ہو (الرحمن : 14)

قرآن میں جنّات کی تخلیق کو اللہ نے آگ کے عنصر سے جوڑا ہے، جیسے فرمایا

اور جنوں کو آگ کی چمک سے پیدا کیا (الرحمن : 15)

یہ آیت جنّات کی تخلیق میں آگ کے استعمال کو بیان کرتی ہے، جو انسان کے مٹی سے پیدا ہونے کے برعکس ہے۔ جنّات کی مادی تخلیق کا یہ عنصر انہیں انسان سے الگ نوعیت دیتا ہے۔

قرآن میں انسان اور جنّات کے مابین فطری فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت میں کمزوری اور احتیاج ہے، جبکہ جنّات کو ایسی خصوصیات دی گئی ہیں جو انہیں جسمانی لحاظ سے انسان سے زیادہ طاقتور بناتی ہیں۔ جنّات نہ صرف مادی دنیا کے باہر کی حقیقتوں سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ وہ غیر مرئی ہیں اور اپنی پوشیدہ حقیقت کی وجہ سے انسان سے مختلف ہیں۔

اللہ نے دونوں مخلوق، انسان اور جنّات، کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے (الذاریات : 56)

یہ آیت دونوں مخلوقات کی تخلیق کے مقصد کو ایک جیسا بیان کرتی ہے، یعنی اللہ کی عبادت اور اس کی رضا کے لیے، مگر ان کے طریقے اور ساخت میں جو فرق ہے، وہ ان کی عبادت کے مختلف طریقوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

قرآن میں انسان اور جنّات کو عقل اور ارادہ کی صلاحیت دی گئی ہے، مگر جنّات کے پاس ایک ایسی غیبی طاقت ہے جس سے وہ انسان کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا

یقیناً اللہ ان سب کو ایک دن جمع کرے گا، جس دن کوئی شک نہیں ہوگا (الجان : 9)

یہ آیت جنّات اور انسان دونوں کی آخری ملاقات اور ان کی آزادی کے روز کا حوالہ دیتی ہے، جب اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اپنی عدالت کے سامنے پیش کرے گا۔

جنّات کو جسمانی طور پر آزادی حاصل ہے، وہ انسان کے نظارے سے مختلف جہتوں میں حرکت کر سکتے ہیں اور غیبی دنیا کے ساتھ جڑ سکتے ہیں، جبکہ انسان کی ظاہری آزادی محدود ہے اور اس کی زندگی کی تمام سرگرمیاں اور افعال اس کے جسمانی قوانین کے تابع ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو تم سے زیادہ قریب ہوں (البقرہ : 186)

یہ آیت اللہ کی قربت اور انسان کے لیے اس کی رہنمائی کو بیان کرتی ہے، جہاں جنّات اپنی غیبی حالت میں موجود ہیں لیکن انسان کو ہر وقت اللہ کے قریب ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔

نتیجہ

انسان اور جنّات کے مابین تخلیق کا فرق اللہ کی حکمت کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، جس سے اس کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے، جبکہ جنّات کی تخلیق آگ سے ہوئی، جو ان کے غیبی اور مادی عناصر کو منفرد بناتا ہے۔ دونوں کی تخلیق کا مقصد اللہ کی عبادت ہے، مگر ان کی فطری خصوصیات، طاقت، اور وجود میں جو فرق ہے، وہ ان کے مابین ایک روحانی اور مادی فرق کو واضح کرتا ہے۔

انسان اور حیوان میں بنیادی امتیازات

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان اور حیوان کے مابین ایک واضح فرق بیان کیا ہے، جس کا مقصد انسان کی عظمت اور اس کی خصوصی تخلیق کو اجاگر کرنا ہے۔ جہاں حیوانات اپنی جبلت اور جسمانی ضروریات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، وہیں انسان کو اللہ نے فطری عقل،

شعور، ارادہ اور آزاد مرضی عطا کی ہے، جو اسے دیگر جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس فرق کو قرآن میں مختلف آیات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

عقل اور شعور کی عطا

انسان کو وہ عقل و فہم دیا گیا ہے جو اسے اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے، اس سے استفادہ کرنے اور زندگی کے مقصد کو پہچاننے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اور ہم نے زمین میں نہریں جاری کیں تاکہ تم عقل رکھنے والے جان سکو (الروم : 37)

یہ آیت انسان کی عقل کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، جو اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ حیوانات کو اپنی جبلت پر زندگی گزارنے کی اجازت ہے، مگر انسان کو فہم و بصیرت کے ذریعے اپنی زندگی کے مقصد کی تلاش کا موقع دیا گیا ہے۔

ارادہ اور اختیار

انسان کو اللہ نے ارادہ اور اختیار کی طاقت دی ہے، جس سے وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتا ہے، چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا

اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں (الرعد : 11)

یہ آیت انسان کی آزادی اور اختیار کی حقیقت کو بیان کرتی ہے، جس سے وہ اپنے فیصلوں کے ذریعے اپنی تقدیر کا تعین کرتا ہے۔ اس کے برعکس، حیوانات کو یہ اختیار نہیں دیا گیا؛ ان کی زندگی کی بنیاد صرف جبلت اور ضرورتوں پر ہوتی ہے۔

نفس اور روح کی حقیقت

انسان کی تخلیق میں اللہ نے نہ صرف جسمانی عناصر کا استعمال کیا بلکہ روح بھی دم کی۔ یہ روح انسان کو شعور، ذہانت اور اختیار دیتی ہے، جو حیوانات میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن میں فرمایا

اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی (ص : 72)

یہ آیت انسان کے اندر روح کے نفوذ کو بیان کرتی ہے، جو اسے نہ صرف زندگی دیتی ہے بلکہ اس کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو بھی بڑھاتی ہے۔ حیوانات میں روح کا نفوذ نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف مادی جسم کے تابع رہتے ہیں۔

اخلاقی ذمہ داری اور امتحان

انسان کو اخلاقی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کا تعلق اس کی آزادی اور ارادے سے ہے۔ قرآن میں اللہ نے انسان کو امتحان کے طور پر دنیا میں بھیجا ہے، تاکہ وہ اپنی نیک یا بد اعمال کے ذریعے اپنی تقدیر کا فیصلہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اسے اس کی زینت بنایا تاکہ ہم ان کو آزما سکیں کہ ان میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے (الکھف : 7)

یہ آیت انسان کے اخلاقی امتحان کو بیان کرتی ہے، جہاں اس کے اعمال کا فیصلہ اس کی عقل اور ارادے کی آزادی کے تحت ہوتا ہے۔ حیوانات اس امتحان سے آزاد ہیں، کیونکہ ان کی زندگی صرف مادی ضروریات پر مبنی ہوتی ہے اور وہ اللہ کی مرضی کے مطابق صرف جبلت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

قرآن میں اللہ نے انسان کی تخلیق کا مقصد اپنی عبادت اور اللہ کے راستے کی پیروی قرار دیا ہے۔ انسان کے لئے دنیا میں کسی مقصد کو اختیار کرنا اور اس کی تکمیل کرنا ضروری ہے، جو اس کی عقل اور روحانی فطرت سے جڑا ہے۔ اس کے برعکس، حیوانات کا مقصد صرف اپنے جسمانی ضروریات کی تکمیل ہے۔

انسان اور حیوانات کے مابین بنیادی فرق ان کے جسمانی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں میں پایا جاتا ہے۔ انسان کو عقل، شعور، ارادہ، اور اختیار کی صلاحیت دی گئی ہے جو اسے اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کی آزادی دیتی ہے، جبکہ حیوانات اس سے محروم ہیں اور ان کی زندگی جبلت اور جسمانی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ قرآن میں اللہ نے ان امتیازات کو اجاگر کیا ہے تاکہ انسان اپنی عظمت کو سمجھ سکے اور اپنے اخلاقی امتحان میں کامیاب ہو سکے۔

انسان اور موت، تخلیق کا ایک اور رخ

موت انسان کی زندگی کا لازمی اور فطری حصہ ہے، جو اس کے وجود کے ایک اہم اور آخری مرحلے کے طور پر آتا ہے۔ یہ دنیاوی زندگی کی حقیقت کو تسلیم کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور انسان کو اس کی تخلیق کے مقصد کی جانب سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں موت کو صرف ایک فیزیکل حالت کے طور پر نہیں بیان کیا گیا، بلکہ یہ انسان کی حیات کا ایک ضروری پہلو ہے جو اللہ کی قدرت اور حکمت کا مظہر ہے۔ موت انسان کو اس کے فانی ہونے کا احساس دلاتی ہے اور اسے اپنی ابدی زندگی کی تیاری کی ترغیب دیتی ہے۔

موت کا پیغام اور اس کا فلسفہ

قرآن میں موت کو اللہ کی تقدیر کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جسے انسان روک نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے (آل عمران : 185)

یہ آیت بتاتی ہے کہ موت ہر انسان کا مقدر ہے اور اسے سبھی کو چکھنا ہے۔ انسان جتنی بھی کوشش کرے، وہ موت کو نہیں ٹال سکتا۔ اس سے انسان کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ دنیاوی زندگی کو عارضی سمجھ کر اس میں اپنے مقصد کی تکمیل کرے۔

موت کے بعد کا سفر

موت کے بعد انسان کی روح اللہ کے پاس واپس جاتی ہے، اور اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں۔ قرآن میں موت کے بعد کی زندگی کے حوالے سے مختلف جگہوں پر تفصیل دی گئی ہے۔ ایک مقام پر اللہ نے فرمایا :

اور اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ جو تمہارے قتل کا حکم پا چکے تھے، تمہیں باہر نکال لیتے (آل عمران : 154)

یہ آیت موت کے بعد کے اسباب پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان کا سفر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک نئے مرحلے کی جانب بڑھتا ہے۔

موت کا راز اور انسان کی محدودیت

موت انسان کی فانی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ اللہ کی تخلیق کا ایک جزو ہے، اور اس کی زندگی کی مدت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے:

اور تم یہ نہ سمجھو کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں وہ مردہ ہیں (آل عمران: 169)"

یہ آیت موت کے بعد کی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ اللہ کی راہ میں شہادت پانے والے زندہ ہیں اور ان کی زندگی کا ایک اور دائرہ ہے، جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔

موت کے بعد کی سزا یا جزا

قرآن میں موت کے بعد کی جزا اور سزا کے حوالے سے کئی آیات آئی ہیں، جو اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ موت صرف جسم کی حالت کا نام نہیں بلکہ اس کے بعد انسان کی روح کو ایک خاص مقام دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

پس جب وہ ہولناک آواز آجائے گی (ق: 20)

یہ آیت موت کے بعد کے دن کی تصویر پیش کرتی ہے جب اللہ کی عدالت قائم ہوگی اور ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔

نتیجہ

موت ایک حقیقت ہے، جو انسان کو اپنی فانی نوعیت کا احساس دلاتی ہے اور اسے آخرت کی تیاری کی ترغیب دیتی ہے۔ قرآن میں موت کے حوالے سے جو تفصیلات دی گئی ہیں، وہ انسان کو اس کی محدودیت اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ موت انسان کے سفر کا اختتام نہیں، بلکہ اس کی حقیقی زندگی کا آغاز ہے۔

وصیّت (مستوحی از مولانا اسحاقؒ)

جب گردشِ لیل و نہار کی ساعتیں میرے مقدر کا پیمانہ لبریز کر دیں، جب میری سانسیں تقدیر کی لوح پر لکھی آخری حد کو چھو لیں، اور میں خاک کی خاموش آغوش میں سپرد کر دیا جاؤں، تو میرے جنازے کے کنارے کھڑے ہو کر بانگِ دہل یہ اعلان کر دینا کہ میں نے کسی کلمہ گو کی تکفیر کو سندِ اعتبار نہیں جانا، نہ کسی ایسے فرد کو دائرۂ اسلام سے خارج تسلیم کیا جو وحدانیتِ باری تعالیٰ اور ختمِ نبوتِ محمدی ﷺ پر ایمان رکھتا ہو۔

میرا یقین یہی ہے کہ ہم سب ایک ہی نور کی کرنیں ہیں، ایک ہی سرمدی نغمے کی تانیں، ایک ہی حقیقت کے مظاہر۔ محبت وہ عطر ہے جو ہر دل کی مٹی میں ودیعت کر دیا گیا، مگر نفرت کی آندھیوں نے اس کی خوشبو کو زنگ آلود کر دیا۔ میں نے ہمیشہ چاہا کہ انسان کو انسان سے جوڑنے والی وہ مہک دوبارہ زندہ ہو، کہ جہاں قلوب کی سرزمین پر نرمی اور وسعت کے چشمے بہتے ہوں، جہاں کسی کے ایمان پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار فقط اس ذاتِ مطلق کو حاصل ہو، جو ہر دل کے نہاں خانوں سے باخبر ہے۔

پس، میرے بعد، میری یہ وصیت ہوا کے جھونکوں میں منتشر نہ ہونے دینا۔ اسے خزانۂ حکمت کتاب میں ثبت کر دینا کہ میں نے ہمیشہ محبت کو فتوے پر، اخوت کو تفرقے پر، اور حکمت کو جہالت پر فوقیت دی۔ میں نے کبھی عقیدے کی تفہیم کو نفرت کے زہر سے آلودہ نہیں ہونے دیا، نہ کبھی کسی انسان پر کفر کی مہر ثبت کی، بلکہ ہمیشہ یہ آرزو کی کہ علم، تفکر اور محبت کے چراغ ہر شبِ تیرہ میں منور رہیں، کہ کہیں انسان کی عظمت اور دین کی روحانی بلندی، فتووں کی دھول میں گم نہ ہو جائے۔

والسلام

ازل سے ذہنِ آدم غور میں محوِ تجسس ہے
مگر ہر عقدہ مشکل ہے کسی حل کے گماں کے بعد

نیرنگِ حکمت محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی سفر ہے۔ یہ محبت کی لطافت، حکمت کی گہرائی اور کائنات کے اسرار کو یکجا کرتی ہے۔یہاں سوال بھی ہیں اور ان کے جوابات بھی، عشق کی سرمستی بھی ہے اور عقل کی روشنی بھی۔اگر آپ تفکر، عشق، اور حقیقت کی جستجو میں ہیں، تو یہ کتاب آپ کے لیے ہے۔

ISBN 978-627-7771-23-2
Rs. 1499/-
9 786277 771232